ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

جنوری ۲۰۱۴ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱-	قرآن کا پیغام	مسلمانوں کے دو فرائض	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	
۲-	اداریہ	عزم پختہ ہو تو کامیابی ممکن ہے	مدیر	۳
۳-	گوشہ سیرت	کیا مسیح خدا کے بیٹے تھے؟	مسٹر اڈیار، مترجم: ایم، اے، جمیل احمد	۶
۴-		رسول کریمؐ کے دعوتی مکاتیب کی معنویت...	ظفر دارک قاسمی	۸
۵-	تاریخ کے جھروکوں سے	عہد اسلامی کے کتب جانے (قسط ۱۹)	تحریر: مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی تعلیق وترجمہ: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۱۴
۶-		اورنگ زیب کا وصیت نامہ (آخری قسط)	مصنف: ڈاکٹر اوم پرکاش پرسام مترجم: فیضان رشید	۱۸
۷-	راہ عمل	عصر حاضر کے تقاضے اور مسلم نوجوانوں...	عتیق الرحمٰن (پاکستان)	۲۱
۸-	بحث و تحقیق	پہلی صدی ہجری میں ہندوستان میں ''فقہ''...	فرید حبیب ندوی	۳۰
۹-		سیکولرازم: کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں؟	محمد انس فلاحی سنبھلی	۳۵
۱۰-	اسوہ صحابہ	صحابہ کرامؓ کے ایمان افروز واقعات	مفتی تنظیم عالم قاسمی	۴۲
۱۱-	تذکرہ	آہ! مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ	شعیب احسن اعظمی ندوی	۴۷
۱۲-	فقہی مباحث	اسلام امن وسلامتی کا گہوارہ	قمر الزماں ندوی	۵۱
۱۳-	زبان و ادب	شبلی نعمانی اور ان کی اردو شاعری	حافظ ڈاکٹر سعید الرحمان فیضی	۵۵
۱۴	فکر وطن	2014ء کے عام انتخابات...... مسلم ایجنڈا کیا ہو؟	سید احمد ومیض ندوی	۵۸
۱۵-	تعارف وتبصرہ	جدید کتب	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۶۴

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

عزم پختہ ہوتو کامیابی ممکن ہے

ایک فکری وتربیتی مضمون اس شمارے کے لئے قلم بند کیا جا چکا تھا، لیکن جب چار صوبوں میں الیکشن کے نتائج آئے تو حیرت ویاس نے چند سطریں لکھنے پر مجبور کردیا، یاس وحیرت دونوں بیک وقت اسلئے دامن گیر ہوئے کہ الیکشن کے نتائج نے یہ ثابت کردیا کہ ملک کے عوام ایک بہت بڑی تبدیلی کے خواہاں ہیں، جس کا انہوں نے بھرپور ثبوت دیا، جہاں کانگریس وبی جے پی دونوں کا متبادل میسر تھا وہاں اسکو منتخب کیا اور جہاں ایسا ممکن نہیں تھا وہاں کانگریس کی جگہ بی جے پی کو مسیحا تسلیم کرلیا، لیکن ہم جہاں تھے وہیں رہے، نہ کوئی حصہ داری نہ کوئی معاہدہ نہ کوئی کردار، اس کے بغیر لاکھ نمایاں حقیقت صحیح!! کہ مسلمان ووٹ کی بناء پر'' کانگریس'' تھی، ''سماجوادی'' ہے اور'' آپ'' آئی ہے، لیکن وہ کیوں تسلیم کرے کہ آپ اسے لائے ہیں، کیا آپ کا کوئی متحدہ پلیٹ فارم ہے، کوئی محاذ ہے جس نے متفقہ طور پر کسی جماعت سے معاہدہ کیا ہو اور عوام کو واضح پیغام دیا ہو، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر امید کرنا اور کریڈٹ لینا محض ایک خیال ہے،

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جن چار صوبوں میں الیکشن ہوا ان میں لوک سبھا کی صرف ۷۲ سیٹیں ہیں جبکہ صرف صوبۂ یوپی لوک سبھا کی ۸۰ سیٹیں رکھتا ہے، سرکاری ذرائع کے مطابق ۲۲ فیصد مسلم ووٹ ہے جو پارلیمنٹ کے ۵۴۳ سیٹوں پر ہونے والے انتخابات میں ۱۲۲ سیٹوں پر نہ صحیح تو کم از کم ۱۰۰ سیٹوں پر اثر انداز ہی نہیں فیصلہ کن ہوسکتا ہے، یاد رکھا جائے کہ موجودہ چاروں صوبوں کے نتائج نے دو واضح پیغامات دے ہیں، ایک تو یہ کہ عوام کرپشن، فساد زدہ معاشرہ، مہنگائی اور عدم توازن سے عاجز ہوکر تبدیلی کے خواہشمند ہیں، اور دوسرے یہ کہ اگر قوت ارادی مضبوط، عزم جواں اور جہد مسلسل ہو تو کامیابی حاصل کرنے کے لئے ماہ وسال کی ضرورت نہیں،

یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ موجودہ نتائج پر بدنام زمانہ سیاست داں اور بی جے پی کے وزیر اعظم عہدہ کے امیدوار کا کوئی اثر نہیں، تمام تجزیہ کاروں کا تقریبا اس پر اتفاق ہے، لیکن اہم یہ ہے کہ اگر ہوش کے ناخن نہ لیے گئے تو ووٹ کی تقسیم ہوگی اور فرقہ پرست غالب آئیں گے اور ان کی فتح صرف تبدیلی لانے کے لئے ہوگی جیسا کہ عوام نے عندیہ دیا ہے، لیکن وہ فرقہ پرست اس کو اپنا جادو سمجھے گا اور سمجھائے گا، پھر ممکن ہے کہ ہندوستان کے سیکولر آئین کی مخالفت کرنے والی یہ کمیونل مائنڈ جماعت اپنے اقتدار کا فائدہ اٹھائے، ظاہر ہے کہ ہندوستان کی بقاء وسالمیت کے لئے ضروری ہے کہ

سیکولرزم، جمہوریت اور عدم تشدد کی پالیسیاں حکمراں جماعت کی ترجیحات ہوں لیکن، بالخصوص یہ جماعت ان تینوں عناصر میں یقین نہیں رکھتی، رہی بات کانگریس کی تو مسلمانوں کو آخر وہ اس قدر محبوب کیوں؟؟ جبکہ اس محبوب نے وفا نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے بلکہ اس کی جفائیں اپنی تاریخ رقم کر چکی ہیں، اور کیوں نہ کرے وہ جفا کہ BJP و کانگریس ہماری نظر میں ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں، ایک کی پالیسی کھلی ہوئی جارحانہ ہے، تو دوسری نرم خو اور منافقانہ کردار رکھتی ہے،

اس وقت ضرورت ہے کہ ہندوستان میں اپنا اثر و رسوخ رکھنے والے علماء و دانشوران سامنے آئیں اور ان منافقوں کو پہچان کر آئیں جو مسلمان ہونے کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ علماء کو سیاست میں نہیں آنا چاہیے، اپنے تمام ذہنی و فکری بُعد کو بالائے طاق رکھ کر محض اس نکتہ پر متفق ہو کر ایک محاذ بنائیں کہ سیاست میں ہمارا کوئی اختلاف نہیں، ایسا ممکن ہے! اور بہت ممکن ہے! اس سمت میں مختلف انداز سے اقدامات ہوئے ہیں اور لوگ سر جوڑ کر بیٹھے بھی ہیں **لیکن جانے کس کی نظر لگی ہوئی ہے کہ یہ اتحاد قائم نہیں ہو پا رہا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس اتحاد کے وجود میں نہ آنے میں سب سے بڑا دخل یا قصور ان شخصیات کا ہے جن کا عوام میں کافی اثر ہے کہ وہ اس میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لے رہے ہیں، نہ جانے کس انجانے خوف سے وہ خائف ہیں، ابھی دہلی کے انتخابات کا نتیجہ آیا، اس سے قبل ایک کھلا خط لکھا گیا جس میں تمام مؤثر شخصیات کا نام لیکر یہ پوچھا گیا کہ آپ بتائیں کہ ہم مسلمان کس کے ساتھ جائیں، لیکن کوئی جواب نہیں ملا کسی طرف سے، بس وہی ایک راگ پرانا "ہم فرقہ پرستوں کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے" لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ BJP اقتدار کے قریب پہنچ گئی۔ اگر لوک سبھا الیکشن کے ساتھ دہلی کا ذیلی انتخاب ہوا تو وہ اقتدار حاصل کرے گی، اب آپ کہیں اور لکھیں کہ ہم نے ایک نو آموز و نو وارد کا ساتھ دیا اور اس کو بڑھایا تو نہ وہ ماننے کو تیار اور نہ آپ کا کردار واضح، ہاں اگر پھر انتخاب ہوا تو فرقہ پرست طاقتیں اس کو شکست دینے میں ایڑی چوٹی کا زور ضرور لگا دیں گی،**

اب پوری ملت کو سامنے رکھ کر کچھ سوچنے اور کچھ کرنے کی ضرورت ہے، جس ملت کے افراد و رہنما صرف ایک میڈیکل کالج کا نام اپنے بزرگوں سے منسوب کرانے پر فخر کرنے لگیں اور اسکو بڑی کامیابی تصور کر کے اس پر مبارکبادیوں اور تہنیتوں کا ایسا سلسلہ چل پڑے کہ اہل مدارس قومی فنڈ سے تہنیتی استشہارات شائع کرانے میں مسابقہ کرنے لگیں، اور پھر اس مسابقہ میں بازی مارنے کے لئے، دوسرے لوگ بھی بزرگوں کا اور ان کی قربانیوں کا جشن منانے کے لئے بھیڑ جمع کرنے لگیں اور اسی پر ملت کی توانائی صرف ہونے لگے، تو ایسی ملت کا کیا بھلا ہو سکتا ہے، تہنیتوں کا ایسا سلسلہ جو گزشتہ ۷-۸ برس سے چل پڑا ہے پہلے اس قدر نہ تھا معلوم نہیں کہ یہ کہنا

درست ہوگا یا نہیں کہ سطحیت میں بہر حال بہت اضافہ ہوگیا ہے،مظفر نگر فساد کے ہولناک مناظر ابھی نظروں سے اوجھل نہ ہو پائے، ٹھنڈک سے معصوم بچوں کی اموات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے،لوگ ریلیف کیمپوں میں اضطراری زندگی پر مجبور ہیں، زخم ہیں کہ ناسور بنتے جا رہے ہیں وقت کا تقاضہ تھا کہ آئندہ کی تیاری کی جاتی اور قوم کے تحفظ کیلئے ٹھوس سیاسی حکمت عملی تیار کی جاتی لیکن یہاں تو سطحیت نے ایسا قحط عام کیا ہے کہ ہولناک مناظر بھی جشن میں غائب ہو جاتے ہیں، جو لوگ صحیح سمت میں سوچتے اور کچھ کر گزرنے کے خواہاں ہوتے ہیں ان کی آوازیں نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوتی ہیں،

ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام مسلم تنظیمیں جمع ہوکر یہ لائحہ عمل تیار کریں کہ وہ کسی ایک جماعت کے ساتھ متحد ہوکر ہونے والے عام انتخابات میں حصہ لیں گی، جہاں جو ہماری مسلم سیاسی جماعت مضبوط ہے وہاں سیٹوں پر معاہدہ ہو، اس کے علاوہ تمام تنظیمیں متحد ہوکر مجموعی طور پر کسی بھی جماعت سے،حکومت میں حصہ داری اور مسلم مفادات پر معاہدہ کریں، اس کے لیے ضروری ہے کہ پوری بصیرت کے ساتھ وقت کے اس سب سے بڑے تقاضہ کو سمجھ کر اس ضمن میں کوششیں تیز کی جائیں ورنہ مستقبل بڑا کربناک ثابت ہوگا۔ عوام کے مظاہروں اور جلسہ وجلوس کے ذریعہ محض اپنے اثر و رسوخ کا ثبوت دے کر از خود کسی سیاسی جماعت کو متوجہ کرنے کی روش سے کسی ایک فرد کو فائدہ ہوسکتا ہے، پوری تنظیم کو بھی فائدہ نہیں ہوتا!! تو پھر ملت کی کیا بات، اس کام کو اس وقت جو لوگ کریں گے وہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کریں گے اور انہیں اس اجتہادی کوشش کا یقیناً اجر ملے گا، جو لوگ اس طرح کی متحد کوشش سے باز رہیں گے یا اس میں رخنہ ڈالیں گے ان کے چہروں کے ساتھ ان کا جرم بھی منظر عام پر آجائیگا اور پھر عوام انہیں درس عبرت بھی کبھی نہ کبھی دے ہی دیں گے، ان صوبوں میں انتخابات کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر 2014 میں اگر مسلم رہبران ملت نے کوئی کوشش کی تو بہت امید ہے کہ وہ تاریخی کوشش بن جائے ورنہ بہت امکان ہے کہ اب ہوش نہ آیا تو یہ تاریخ میں ایک بڑی غلطی اور سنجیدہ قوم کی بے سنجیدگی اور متواتر غفلت لکھی جائے، اگر ایسا نہ ہوا تو یقیناً ملت کے نوجوانان اسے تجاہل عارفانہ سے تعبیر کریں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

گوشۂ سیرت

کیا حضرت مسیحؑ خدا کے بیٹے ہیں؟

تحریر: مسٹر اڈیار
مترجم: ایم، اے جمیل احمد

ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجسموں کو توڑنے اور تصاویر کو ہٹانے کا ایک عظیم انقلابی کام انجام دیا، تاریخ انسانی کا ایک اور عظیم انقلاب آپؐ کے ہاتھوں رونما ہوا ہے۔

باپ، بیٹا، روح القدس کی تثلیث عیسائیوں کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔

گنہگاروں کو نجات دلانے اور انسانی گناہوں کی سزا خود بھگتنے کے لیے سولی پر چڑھ کر حضرت مسیحؑ نے جان دی۔ پھر تیسرے روز زندہ ہوکر باپ کے بائیں طرف مسند نشیں ہوئے۔ یہ ہے عیسائی حضرات کا عقیدہ۔

۱۔ حضرت مسیحؑ خدا کے بیٹے ہیں۔

۲۔ وہ مرنے کے بعد زندہ ہو اٹھے۔

مندرجہ بالا ان دو باتوں کو نہ ماننے والے لوگ عیسائی نہیں ہو سکتے۔ یہ دونوں عقیدے عیسائی دنیا پر چھائے ہوئے تھے کہ نبی کریمؐ کی بعثت ہوئی۔ آپؐ نے ان دونوں عقیدوں کو باطل قرار دیا۔ آپؐ نے بتلایا:

حضرت مسیحؑ خدا کے بیٹے نہیں خدا کے نبی تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ وہ مصلوب نہیں ہوئے۔ انہیں گرفتار کرنے کے لئے جب ایک گروہ ان کے کمرے میں داخل ہوا تو انہی میں کا ایک شخص انہی کا ہمشکل نظر آنے لگا۔ اسی ہمشکل انسان کو صلیب پر چڑھایا گیا، قرآن میں فرمایا گیا ہے:

”فی الواقع انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا“

بائبل میں جن انبیاء کا ذکر ملتا ہے ان سبھی انبیاء کا ذکر قرآن میں بھی ہوا ہے۔ مثلاً حضرت آدمؑ، ابراہیم، اسحٰقؑ، اسمٰعیلؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، ہارون، داؤد، سلیمان، یونس، الیاس، زکریاؑ، وغیرہ وغیرہ۔ انہی نبیوں کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کا نام بھی لیا گیا ہے۔ قرآن میں صاف طور پر واضح کر دیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ایک نبی تھے۔ ان میں الوہیت کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ عیسائیوں اور مسلمانوں میں کیا اختلاف ہیں یہ مسئلہ یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ میں جس زاویہ سے مسئلہ کو دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ جس مذہب کا اس وقت غلغلہ تھا، جو اس وقت ایک عظیم طاقت کی حیثیت سے دنیا میں موجود تھا، اس کے غلط عقیدے کے خلاف نبی کریمؐ نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر آواز اٹھائی

لیکن اس جد وجہد میں حضرت عیسیٰؑ کے احترام یا عزت میں کوئی کمی نہ آنے دی۔

حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھ روح القدس سے مضبوط کیے گئے تھے انکے ذریعہ آپؑ کو انجیل عطا کی گئی۔ ان دونوں حقیقتوں کو الکتاب (قرآن حکیم) نے بہت ہی صاف الفاظ میں پورے فخر و احترام کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بالکل اسی طرح دیگر مذاہب کی غلط باتوں کا تو قرآن انکار کرتا ہے لیکن ان کی مذہبی شخصیتوں کا احترام کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

غلط باتوں کی تردید۔

شخصیتوں کا احترام۔

ان دو باتوں کو اسلام نے گڈ مڈ نہیں کیا ہے بلکہ واضح الفاظ میں ان دونوں باتوں کی تعلیم فرمائی ہے۔

ایمرجنسی کے زمانہ میں میسا کے تحت مجھے بھی جیل میں ڈال دیا گیا تھا! اس وقت مجھے دنیا کے مختلف مذاہب کے صحیفوں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

میرے رشتہ داروں نے دوستوں اور احباب نے اور بعض مسلم دوستوں نے ان مقدس کتابوں کو مجھ تک پہنچایا۔

ان سارے صحیفوں کے مطالعہ میں جس کتاب سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا اور جو مجھے اپنی نظروں میں سب سے زیادہ جچی وہ کتابِ پاک قرآن مجید ہے۔

☆☆☆

بہ نام خدا
جو مسلمانوں کے امور کو اہمیت نہ دے وہ ان میں سے نہیں (حدیث نبیؐ)

S.A.IBNe GHOURI (Rtd Lecturer)
Writer
H.NO : 11-3-946, Flat No : 301,
New Malla Pally, HYDERABAD-1
Mob : 9392460130

ایس۔اے۔ابن غوری (موظف لکچرر)
قلم کار
امتیاز ریزیڈنسی مقابل امبا ہاسپٹل، چوراہا نیو ملے پلی
حیدرآباد-۱ (فون: ۲۳۳۴۴۰۲۳)

اردو کا دوسرا نام شائستگی ہے

مدیر محترم ...... السلام علیکم

بات، علماء اور عروب کی

کاش! اس شان دار روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ہمارے ممتاز و مقتدیٰ علمائے کرام (اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے) عرب ممالک (خصوصا فلاں ملک) کے حکمرانوں کو متوجہ/متنبہ فرماتے کہ آپ محتشم حضرات نے نصاریٰ و یہود کو دوست بنا کر (بالخصوص قاتل امریکا کی انگلی پکڑ کر چلتے ہوئے) قرآن مجید کی توہین کر رہے ہیں، اسلام کو بدنام کر رہے ہیں اور امت محمدیہ کو ذلیل کر رہے ہیں! آخر کب تک؟ انجام تو آپ کا بھی خالی ہاتھوں کے ساتھ دو گز زمین ہی ہے! دیدہ ور اقبالؔ نے تو اسّی سال پہلے ہی کڑھن کے ساتھ کہہ دیا تھا۔

مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

بادیدۂ نم: ابن غوری (معظم پورا، حیدرآباد-۱

اولاد کو اردو سکھائیے۔ ہر ماہ ایک اردو رسالہ/کتاب خریدیے۔ سائن بارڈ پر اردو لکھوائیے۔ خطوط پر پتے اردو میں لکھیے۔

''فکر دین'' میسر نہیں اگر تجھ کو | تراوجود ہے ''خیرالامم'' کی رسوائی

گوشۂ سیرت

رسول کریم ﷺ کے دعوتی مکاتیب کی معنویت عہد حاضر میں

ظفر دارک قاسمی ریسرچ اسکالر شعبہ دینیات، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد ﷺ کی حیات طیبہ تمام عالم انسانیت کے لیے نمونۂ عمل ہے اللہ تعالیٰ انسانیت کی ہدایت اور تعمیر و ترقی کے لیے وقت اور حالات کی مناسبت سے ہر دور میں اپنے منتخب و برگزیدہ بندوں کو مختلف اقوام میں مبعوث کرتا رہا ہے جو انسانی تہذیب و تمدن کے سچے علمبردار رہے تاریخ شاہد ہے کہ جب نبوت کا بارگراں پڑنے سے آپ ﷺ کو خوف زدگی کی کیفیت محسوس ہوئی اور پورا واقعہ حضرت خدیجہؓ کو سنایا اور کہا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے اس وقت حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے جو کچھ کہا وہ احادیث کی کتابوں میں موجود ہے بخاری شریف میں ہے ''ہرگز نہیں۔ اللہ کی قسم اللہ آپ ﷺ کو کبھی رسوا نہیں کریگا، بے شک آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں بے سہارا لوگوں کا بار اٹھاتے ہیں۔ ناداروں کو کما کر دیتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں، نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔'' بظاہر یہ پانچ صفات ہیں مگر اس میں خدمت خلق و فلاح عام کی قابل تقلید مثال موجود ہے جو کہ زمان و مکان سے بالاتر ہر انسان کے لیے نمونہ ہے۔ اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی سرشت میں بھی انسان دوستی رکھ دی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ساری زندگی امن و امان اور انسانیت کو بلند مقام بخشنے کی سچی داستان ہے۔ آپ نے بعثت سے قبل بھی امن، قومی یکجہتی اور انسان دوستی کی بحالی کی بھرپور کوشش کی کیونکہ اس وقت دنیا میں، بدامنی، خلفشار کا دور دورہ تھا۔ برائیوں کا سلسلہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا، ماخذ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حرب فجار خونریزی میں سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔ یہ جنگ قبیلۂ قریش اور قبیس کے درمیان ہوئی تھی، اس طرح کی متواتر لڑائیوں سے سیکڑوں گھر برباد ہوگئے اور قتل و غارت گری ایک عادت بن گئی تھی، یہ دیکھ کر بعض طبقوں میں امن و سلامتی کی تحریک پیدا ہوئی اور خاندان کی سرکردہ شخصیات اور رسول ﷺ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب کی تجویز پر ۲۰؍ ذی القعدہ عام الفیل میں ایک معاہدہ ہوا جس میں آپ ﷺ بھی شریک تھے۔ قیام امن کے اس معاہدہ کو تاریخ میں حلف الفضول کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس معاہدہ کے وقت آپ ﷺ کی عمر بیس سال تھی یہ

معاہدہ آپ کے نزدیک اتنا اہم تھا کہ آپ عہد نبوت میں فرمایا کرتے تھے ''عبداللہ بن جدعان کے گھر معاہدے کے وقت میں موجود تھا۔ اس کے بدلے میں سرخ اونٹ بھی دیے جاتے تو لینا پسند نہ کرتا۔ اسلام میں اس معاہدہ کے لیے بلایا جائے تو میں ضرور شریک ہوں گا'' یہ بھی فرمایا کہ ''جاہلیت میں جو معاہدہ تھا، اسلام نے اسی کے استحکام ہی کو بڑھایا ہے''

اس معاہدے میں بنو ہاشم، بنو مطلب، بنو اسد اور بنو تمیم شامل تھے۔ معاہدہ کی اہم نکات یہ ہیں۔ (۱) ہم ملک سے بدامنی دور کریں گے۔ (۲) ہم مسافروں کی حفاظت کیا کریں گے (۳) ہم غریبوں کی امداد کیا کریں گے۔ (۵) ہم مکہ یا غیر مکہ کے مظلوموں کی حمایت کریں گے۔ اس معاہدہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ قیام امن اور خدمت انسانیت کو کس درجہ اہمیت دیتے تھے سچی بات یہ ہے کہ روئے زمین پر کوئی ایسی قوم نظر نہیں آتی تھی جو انسانیت کو سنبھالا دے۔ ظلم و عداوت، قتل وقتال اور بدامنی اور حکم عدولی جیسے جرائم آخری حدوں کو پار کر چکے تھے۔ حق و صداقت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ حضرت سلمان فارسی جیسے ایمان و یقین کے متلاشی کو ایران سے لیکر شام کی آخری حدوں تک صرف چار اشخاص ایسے ملے تھے جو انبیاء کے بتائے ہوئے راستے پر تھے۔ اس عالم گیر تاریکی، پستی کا نقشہ قرآن مجید اس طرح کھینچتا ہے۔ ''خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے'' انسانیت کی پستی انتشار اور خدا فراموشی کی ایک مؤثر تصویر حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے استفسار پر مہاجرین کی طرف سے حضرت جعفر طیار کی جانب سے کی جانے والی تقریر میں نظر آتی ہے۔ ''اے بادشاہ ہم جاہلیت میں پڑی ہوئی قوم تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے۔ مردار کھاتے تھے۔ فحش کام کرتے تھے۔ قطع رحمی کرتے تھے۔ پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے۔ عہد و پیمان کا پاس کرنے میں بُرا رویہ رکھتے تھے اور ہم میں طاقتور کمزوروں کو کھا جاتا تھا''

انسانیت کی اس زبوں حالی میں اللہ رب العزت کی طرف سے رسول رحمت کا ورود مسعود ہوا بعثت کے بعد کفار مکہ نے آپ کو اور آپ کے جانثار صحابہؓ کو سخت ترین اذیتیں پہنچائیں۔ اسی اثناء حضور نے مدینہ کو ہجرت فرمائی چنانچہ سن ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ ہوئی، جو بقائے باہم، امن و امان پر مبنی تھی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے مختلف غیر مسلم امراء کو دعوتی خطوط روانہ فرمائے۔ جن کا مقصد تمام انسانیت کو امن و سلامتی کی آزادی، اخوت، مساوات اور حق شناسی سے آشنا کرانا تھا حضور ﷺ نے ان دعوتی خطوط کے ذریعہ لوگوں کو سچی ہمدردی سکھائی اور فساد زدہ دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے کی کامیاب ترین سعی کی اس دنیا کو چین وسکون کی اس وقت بھی ضرورت تھی چنانچہ آج بھی اس دنیا کو عدل وانصاف امن وشانتی کی شدید ضرورت ہے۔ جو دعوتی مکتوب آپ ﷺ نے بادشاہوں کو روانہ فرمائے تھے ان کی اہمیت افادیت کو بڑھانے کے لیے چند پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں جن کو سطور ذیل میں بیان کیا جائیگا۔ دراصل ان دعوتی خطوط کے ذریعہ نوع انسانیت کو خیر

خواہی، شانتی اور جذبہ خیر سگالی کا درس دینا مقصد تھا۔
ان خطوط کو دو بنیادی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک، مسلم امراء و قبائل کے نام۔

(۲) دوسرے، غیر مسلم امراء و قبائل کے نام۔

رسول اللہ ﷺ نے جن مسلم امراء قبائل یا غیر مسلم بادشاہوں کو خطوط ارسال فرمائے، ان کی تعداد تقریباً تین سو پچاس ہے ان میں سے چند نمایاں حسب ذیل ہیں:
شاہ حبشہ اصحمہ نجاشی، شاہ روم قیصر ہرقل، فارس کسریٰ خسرو پرویز، شاہ اسکندریہ و مصر مقوقس، شاہ بحرین منذر بن ساویٰ شاہ یمامہ ہوذہ بن علی، شاہ دمشق حارث غسانی شاہ عمان جیفر وعبد، اہل نجران مسیلمہ کذاب، بنو جذامہ، بنو بکر بن وائل ذی الکلاع وغیرہ۔

چند غیر مسلم امرا کے علاوہ اکثر امراء و قبائل نے اسلام قبول کر لیا اور کفر کے اندھیروں سے نکل کر ایمان و اسلام کی روشنی میں آگئے۔ رسول ﷺ نے غیر مسلموں کے علاوہ امراء قبائل کے نام بھی فرامین جاری فرمائے۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

خالد بن ولید، منذر بن ساویٰ، فردہ بن عمرو جذامی، اکیدر، وائل بن حجر، مالک بن نمط، بنی نہد، اہل حضر موت، قبائل عباہلہ

پہلی خصوصیت

اگر ہم ان کو ادبی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مراسلات ادب نگاری کا بہترین مرقع ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے مراسلات میں مکتوب نگاری کی تمام عمدہ واعلیٰ خوبیاں نمایاں ہیں۔ کلام اللہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی گفتگو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ عروج و کمال کی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ آپ ﷺ کے مراسلات طوالت بیان سے پاک اور مسجع و مقفیٰ عبارت آرائی کے تکلف و تصنع سے کوسوں دور ہیں۔ الفاظ کے گورکھ دھندوں اور لفظ و بیان کی نمایش کے بجائے اسلوب کی سادگی نمایاں ہے، مراسلات ایجاز و اختصار کا عظیم شاہکار ہیں۔ مراسلات کے علاوہ یہ خصوصیت آپ ﷺ کی عام گفتگو میں بھی پائی جاتی ہے۔ مراسلات کا ہر جملہ پیغمبرانہ صداقت وامانت کا آئینہ دار ہے۔ یہ پختہ یقین، بلند حوصلہ اور عزم مصمم کے ساتھ دعوت حق سے معمور ہیں۔

دوسری خصوصیت

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ مراسلات دعوتی انداز سے بھی انتہائی اہم ہیں ہمارے ماخذ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مشرکین عرب کے علاوہ عیسائی، یہودی اور مجوسی امراء اور سرداروں کے نام دعوتی پیغامات اور مراسلات کا سلسلہ جاری رکھا جن میں انھیں وعظ و نصیحت کی گئی اور ایمان یقین اور عمل کی دعوت دی گئی۔

مشرکین عرب کے نام دعوتی پیغامات میں آپ نے انھیں شرک و بت پرستی سے اجتناب اور تنہا اللہ تعالیٰ کی بندگی کی دعوت دی اور اپنی آخرت کو سنوارنے اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر حساب دینے پر یقین کی دعوت دی۔ علاوہ ازیں رسالت محمدی تسلیم کرنے کو کہا اور دینی و دنیاوی معاملات میں اتباع نبوت کا حکم دیا۔

عیسائیوں کے نام دعوتی مراسلات میں انھیں مشترک امر یعنی توحید اور عیسیٰ بن مریم کے اللہ کا بندہ و رسول اور کلمۃ اللہ ہونے کے ناتے سے اسلام اور اپنی نبوت کی تصدیق و اتباع کی دعوت دی ہے جیسا کہ قیصر، مقوقس اور اہل نجران کے نام خطوط سے عیاں ہے۔

مجوسیوں کے نام پیغام میں آپ نے انھیں اہرمن اور یزداں کی پوجا چھوڑ کر ایک اللہ عزوجل کی طرف بلایا اور تمام کائنات کے لیے اپنے رسول ہونے کا اعلان کیا، اور انھیں توحید اور رسالت پر ایمان کی دعوت دی جیسا کہ خسرو پرویز کسریٰ کے نام خط سے ظاہر ہے۔ کسریٰ سے اسلام قبول کرنے کی صورت میں امن وسلامتی کا وعدہ فرمایا اور اسلام قبول کرنے سے انکار کی صورت میں اسے تمام اہل فارس کی گمراہی اور تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ لیکن اس بدبخت نے رسول اللہ ﷺ کے نامۂ مبارک کو پھاڑ ڈالا۔ رسول اللہ نے اس کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی پیش گوئی فرمائی جو کہ سچ اور درست ثابت ہوئی۔

تیسری خصوصیت

تیسری خصوصیت یہ ہیکہ مسلم امراء وقبائل کے نام مراسلات دعوتی نوعیت کے نہیں، بلکہ وعظ ونصیحت پر مبنی ہیں اور بعض نماز، روزہ کے مسائل اور خصوصاً زکوٰۃ کی تفصیلات پر مشتمل ہیں، مثلاً زکوٰۃ کی مقدار نصاب، مقدار واجب زکوٰۃ میں دیے جانے والے مال کی اہمیت ونوعیت اور حالت وغیرہ۔ مسلم امراء کے نام بعض مراسلات انتظامی نوعیت کی ہدایت پر مشتمل ہیں مثلاً امراء کو آراضی دینے اور ان کی حکمرانی کو برقرار رکھنے کے احکام۔ اہل دومۃ الجندل کو ملکیت باغات اور آراضی کی نوعیت کا خط لکھ کر ایک قسم کا معاہدہ فرمایا۔ اسی طرح وائل بن حجر کے نام خط میں ان کی تمام جائیداد کو ان کی ملکیت میں برقرار رکھا گیا ہے اور کسی دوسرے آدمی کے اس زمین سے ہر قسم کے تعرض کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ معاہدات کے ضمن میں مختلف قبائل کو عہد و پیماں پر کاربند رہنے اور رسول اللہ ﷺ کی حرمت کا لحاظ رکھنے کی ترغیب دی ہے۔ مسلم امراء وقبائل کو ایمان وعمل پر ثابت قدم رہنے کی صورت میں اجر وثواب، انعام واکرام اور جنت کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ جبکہ غیر مسلم امراء کو اسلام قبول کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے پر امن وسلامتی اور مغفرت وبخشش کی نوید دی گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے بحیثیت بشیر و نذیر پیغمبرانہ صداقت کی وجہ سے کفار کو ڈنکے کی چوٹ پر ایمان سے انکار کی حالت میں جزیہ اور جزیہ سے انکار پر جنگ کی دھمکی دی اور جہنم کے عذاب سے ڈرایا دھمکایا اور ان کو اس سے آگاہ کردیا۔ کہ حکمراں وسردار قبیلہ کے اسلام قبول نہ کرنے پر اس کی تمام رعایا اور اہل قبیلہ کا گناہ اس کی گردن پر ہوگا، جب کہ مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عدم عمل کی صورت میں ان کی املاک کی واپسی اور امراء وقبائل کی معزولی کی دھمکی دی اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے ڈرایا ہے۔

چوتھی خصوصیت

سیاسی ماخذ بتاتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی میں دنیا میں دو بڑی بنیادی سلطنتیں قائم تھیں، یعنی سلطنت روم

اورسلطنت فارس، جبکہ جزیرہ نمائے عرب میں قبائلی طرز زندگی رائج تھا۔سلطنت روم میں عیسائی مذہب ترقی کر رہا تھا کیونکہ قیصر مذہباً عیسائی تھا اور مسیحی مذہب کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی، یہی حیثیت فارس میں مجوسی مذہب کو حاصل تھی۔اوروہاں کی آبادی اہرمن اور یزداں کواپنا خالق تصور کرتی تھی۔ جزیرۂ عرب میں گردش ایام نے ملت ابراہیمی کی جگہ بت پرستی کوجنم دیا۔لوگوں نے ملت ابراہیمی سے روگردانی کی اوراللہ کےعلاوہ کئی معبودان باطلہ بنالیے تھے۔ یوں رومی مسیحی گمراہیوں کا شکار ہوچکے تھے، فارسی عوام تو ہم پرستی میں مبتلا تھے اورعرب قبائل ملت ابراہیمی سے انحراف کےعلاوہ فخرومباہات اورشدید باہمی نفرت اور تعصب کی فضا میں زندگی بسر کررہے تھے۔پوری دنیا کفرو شرک کی لپیٹ میں تھی۔ اورکفروشرک کی ظلمت چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ انسانیت گمراہیوں کی دلدل میں بری طرح دھنسی ہوئی تھی اورظلم وستم کی چکی میں بری طرح پس رہی تھی۔اب وقت آگیا تھا کہ دنیا سے ظلم وستم کا راج ختم کردیا جائے، ذات پات کی اونچ نیچ اورامیروغریب اورآقاوغلام کا فرق مٹادیا جائے اورکفروشرک کی بیخ کنی کردی جائے۔دنیا میں ہمہ گیراورعالم گیرامن کی ضرورت تھی لہٰذا دنیائے ضلالت کے عین وسط میں محمدﷺ آفاقی امن وفلاح کا پیغام لے کر فاران میں نمودار ہوئے اور لوگوں کے سامنے اپنا پیغام پیش کیا چندارواح مقدسہ نے اس پیغام کودل وجاں سے قبول کرلیااور بارگاہ رسالت میں حاضری کا شرف حاصل کرتے ہوئے فیض یاب ہونے لگے تھے۔اب وقت آگیا تھا کہ جزیرہ عرب کورشدوہدایت کی آغوش میں لینے کے بعد رحمۃ للعالمین ہونے کا عملی مظاہرہ کیا جائے چنانچہ جاں نثاروں کوجمع کرکے اعلان کیا گیا کہ مجھے تمام جہانوں کے لیے رحمت اوررسول بنا کربھیجا گیا ہے۔لہٰذا پیغام امن وانقلاب لےکرقریب وبعید قبائل اورارباب اقتدار کے پاس جاؤ اورانھیں اسلام کی آغوش میں لے آؤ۔ بصورت دیگروہ ذلیل ورسوا ہوکر جزیہ دینے کے لیے آمادہ ہوجائیں۔ ورنہ اللہ اوراس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار رہیں۔کیونکہ یہی اللہ اوراس کےرسول کا حکم ہے۔ مذکورہ تینوں صورتوں میں سے ایک کے انتخاب میں ہرشخص کوضمیرورائے کی مکمل آزادی دی گئی چنانچہ کئی ایک حضرات نے اس دعوت کوقبول کرلیا اورکئی ایک نے خاموشی اختیار کرلی۔صرف کسریٰ نے اپنی بدبختی کودعوت دی اورنامہ مبارک کوچاک کرکےقعرمذلت کےکنویں میں جاگرااورہمیشہ کےلیے ناکام ونامراد ہوگیا۔

جہاں دیگرعرب قبائل اورروم وفارس اورحبشہ کے حکمرانوں کودعوتی مراسلات ارسال کیے گئے، وہاں یمن کو خصوصی اہمیت دی گئی۔یمن اپنی زرخیزی، شادابی، خوش حالی اورمنظّم ومستحکم نظام حکمرانی کی وجہ سےعرب کے دیگر علاقوں کے مقابلے میں نمایاں وامتیازی حیثیت رکھتا تھا، لہٰذا عالمی دعوتی پروگرام میں یمن پرخصوصی توجہ دی گئی۔ اکثرخطوط اس علاقے سےتعلق رکھنےوالے قبائل کی طرف لکھے گئے۔مراسلات کے ذریعے دی جانے والی دعوت کو قبول کرتے ہوئے مندرجہ ذیل قبائل وفود کی صورت میں

دربار رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے اور اسلام سے بہرہ ور ہوکر رشد و ہدایت کے ستارے بن کر دنیا کو جگمگایا۔

وفد عبدالقیس، وفد اشعریین، وفد کندہ ازد، وفد ہمدان، وفد غامد، وفد نخع، وفد بنی الحارث، وفد دوس، وفد تجیب، وفد بہرہ اور وفد نجران و حضرموت۔

یہ وفود اپنے سرداروں اور ممتاز افراد کی قیادت میں حاضر ہوئے اور ذہنی و فکری انقلاب کے بعد دینی مسائل سیکھتے، سیاسی نکات حاصل کرتے اور نصائح سے فیض یاب ہوکر اصول جہاں بانی و حکمرانی معلوم کر کے اپنے اپنے علاقوں کو واپس روانہ ہو گئے۔

پانچویں خصوصیت

یہ خصوصیت بھی انتہائی اہم ہے یعنی امن و امان کا قیام اور ظلم و زیادتی کا سد باب ان مراسلات میں ایمان کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ امن و سلامتی کا قیام بھی موجزن ہے۔ نیز ان کو ایک طرح کی سیاسی عدالتی اور سرکاری حیثیت حاصل ہے۔ رسول ﷺ نے اپنی نبوی زندگی میں انسانی جانوں کے احترام کی لازوال مثالیں قائم کیں۔ ماخذ بتاتے ہیں کہ ۲۳ سالہ نبوی زندگی میں چھوٹی بڑی ۸۳ جنگیں لڑیں جن میں ۵۶ سرایا اور ۲۷ غزوات ہیں ان جنگوں میں ۲۵۹ مسلمان شہید اور ۷۵۹ کفار مارے گئے جبکہ ایک سو مسلمان اور ۶۵۶۴ کفار اسیر ہوئے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب عہد نبوی کے میدان جنگ میں جو تبصرہ کیا ہے وہ انتہائی ئی اہمیت کا حامل ہے۔

''عہد نبوی ﷺ کی جنگیں تاریخ انسانی میں غیر معمولی طور پر ممتاز ہیں اکثر دگنی تگنی اور بعض وقت دس گنی قوت سے مقابلہ ہوا اور تقریباً ہمیشہ ہی فتح حاصل ہوئی۔''

تاریخ میں لکھا ہوا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر نبی مکہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہوتے ہیں تو اہل مکہ کے ساتھ درگذر اور رواداری کا جو سلوک فرمایا انسانی تاریخ میں اس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔ تمام مجرمین سزا کے منتظر کھڑے تھے مگر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اچھا جاؤ تم سب آزاد ہو۔ آج اکیسویں صدی کی غالب تہذیب کو اپنی نام نہاد انسانی آزادیوں پر فخر ہے۔ مگر ایک فاتح قوم کی صورت میں مفتوحین کے ساتھ جو توہین آمیز سلوک روا رکھتی ہے اس کو اگر رسول رحمت کے دعوتی مکاتیب کی روشنی میں دیکھا جائے تو انسانیت شرمسار ہو جاتی ہے۔

ان دعوتی مکاتیب کا بنیادی مقصد بھی اتحاد امت اور عدل و مساوات کو پروان چڑھانا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن امراء نے ان مکتوب کی آواز پر لبیک کہا وہ خود دنیا میں امن و امان اور حق و صداقت کے علمبردار بنے رہے۔ محمد ﷺ نے ان مکتوب کے ذریعہ بھی نوع انسانیت کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی ہے چنانچہ عہد حاضر میں بھی دنیائے انسانیت کو اخوت، شانتی، عدل و مساوات کی سخت ضرورت ہے اگر ہم ان بنیادی حقوق کو تلاش کریں تو ہمیں عہد رسالت میں ان گنت نمونے مل جائیں گے۔ جو عالم انسانیت کو کامیاب و کامران بنانے میں معاون ثابت ہوں گے۔

☆☆☆

تاریخ کے جھروکوں سے

عہد اسلامی کے کتب خانے (قسط۱۹)

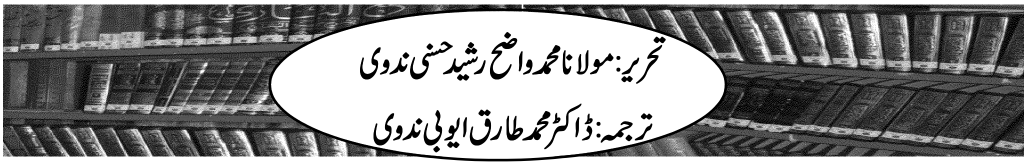

تحریر: مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی
ترجمہ: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

عہد اسلامی میں قائم کیے گئے کتب خانوں میں پہلا کتب خانہ بیت الحکمہ ہے، اسے بغداد میں ہارون رشید نے قائم کیا، لیکن مامون رشید کے زمانے میں بیت الحکمہ نامی یہ کتب خانہ نقطۂ عروج کو پار کر گیا، اس میں علمی، طبی اور اسلامی علوم سے متعلق کتابیں جمع کی گئیں، علمی وفکری راہوں کو عام کرنے اور ترقی عطا کرنے میں اس مکتبہ کا بڑا کردار رہا ہے۔

اندلس میں بڑے بڑے کتب خانے قائم کیے گئے، سب سے بڑا کتب خانہ قرطبہ کا تھا جس کو حکم بن الناصر نے ۳۵۰ھ میں قائم کیا تھا، اندلس و بغداد کے خلفاء کی طرح مصر میں فاطمیوں نے کتب خانوں کے قیام میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا، عزیز باللہ الفاطمی نے ۳۵۳ھ میں خزانۃ الکتب کے نام سے ایک کتب خانہ قائم کیا، اس کے متعلق منقول ہے کہ اس میں ۶۰۰۰۰۰ ہزار کتابیں تھیں، ایک ایک کتاب کے کئی کئی نسخے تھے۔

چوتھی پانچویں صدی ہجری میں کتب خانوں کی کثرت ہوگئی، ساتھ ہی کتاب فروشوں اور کاتبوں کی تعداد میں قابل ذکر اضافہ ہوا، بعض کتابوں پر لوگوں کی بے پناہ توجہ کے سبب ان کو بھاری قیمتوں میں فروخت کیا جاتا تھا جو از خود لوگوں کی کتابوں سے غایت درجہ دلچسپی اور نئی کتابوں کے حصول کے شغف کی دلیل ہے، صاحب بن عباد نے کتاب الاغانی کو خریدنے میں جس طرح کثیر مال خرچ کیا وہ خود بھی اس کی دلیل ہے، اس طرح حکومتوں کے انتظام سے قائم ہونے والے کتب خانوں کے علاوہ بے شمار ذاتی کتب خانے قائم ہوئے، تاریخ میں یہ تذکرے بھی ملتے ہیں کہ عباسی خلفاء نے ملوک عجم سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کی کہ وہ علمی کتب جو ان کے مکتبوں میں ہیں انھیں مہیا کرائیں، اس زمانے میں مسلمان پورے طور پر علم کی طرف متوجہ تھے جب کہ غیر اسلامی ملکوں میں علم بعض خاص طبقوں کی جاگیر تھا، عہد رشید میں فلسفہ وسائنس اور بحث و تحقیق کی کتب کو کتب خانے میں رکھ کر تالا لگا دیا گیا، اور ان سے استفادہ کو ممنوع قرار دے دیا گیا، اس کا سبب یہ تھا کہ اہل کنیسا کی بات تسلیم کی جانے لگی تھی اور ان کا یہ اصرار تھا کہ علم کو عام کرنے سے روکا جائے اس لیے کہ اس سے روم کے علاقوں میں عقائد میں فساد پیدا ہو رہا ہے، جبکہ روم کے ان علماء و فلاسفہ کا تعاقب کیا جاتا تھا جن کی آراء اصحاب کنیسا کی آراء سے بالکل مختلف ہوتی تھیں۔

زیادہ تر علمی کتابوں کے نقل و ترجمے کا کام تیسری اور چوتھی صدی میں کیا گیا، پھر لوگوں نے ان کتابوں پر تعلیقات وحواشی کا اہتمام کیا اور دیگر اجزاء کے ساتھ اسلامی مملکت میں ان کی نشر واشاعت کی ابتدا کی، بعض کاغذ فروشوں کی دکانیں خود چھوٹا سا کتب خانہ ہوا کرتی تھیں، بعض محققین تو کاغذ فروشوں کی دکانوں کے بار بار چکر لگاتے تھے کہ وہاں جو کتابیں میسر ہوں ان سے استفادہ کرسکیں، ایسے اصحاب علم وقلم میں مشہور محقق وصاحب قلم جاحظ ہے جو دن کا اکثر حصہ ان ہی دکانوں میں گذارتا تھا، اگر یہ روایت صحیح ہے کہ جاحظ کی موت اس کے اوپر کتابوں کے ایک ڈھیر کے گرنے سے دب کر ہوئی، تو اس روایت سے تیسری صدی ہجری میں کتب خانوں میں کتابوں کی وافر مقدار کا پتہ ملتا ہے، کتب خانوں کے وجود پر دلالت کرنے والی سب سے خاص جو روایت ہے وہ دیوان حماسہ کی تالیف سے متعلق ہے کہ ابوتمام نے دیوان حماسہ کو ایک گھر میں چند روزہ قیام کے دوران وہاں موجود مختلف کتب سے منتخب کیا، اسی طرح یہ روایت ہے کہ صاحب بن عباد جب سفر کرتا تو اس کے ساتھ ۴۰ اونٹ کتابوں سے لدے ہوتے تھے، ان روایات سے نہ صرف حکومت کی زیر نگرانی کتب خانوں کے قیام کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے کاروان علم وثقافت کی قیادت کی ہے، انھوں نے لاتینی زبان کے احیاء کا کام بھی کیا ہے، لاتینی زبان میں جو کچھ بھی علمی چیزیں تھیں سب کو منتقل کرلیا، ایسی علمی بحثیں اور ایسے علمی دفینے دریافت کیا کہ وہ روشنی کا سبب بن گئے اور یہ کارنامے مسلمانوں نے اس دور میں انجام دیا جب کہ یورپ کا علمی بازار ٹھنڈا نہیں بلکہ سونا پڑا ہوا تھا، فارسی زبان کی متعدد کتابون کا عربی میں ایسا ترجمہ کیا گیا کہ وہ آج تک مسلمانوں کے علمی ذخیرے کی زینت ہے جب کہ اصل کتابوں کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔(۱)

عہد اسلامی کے شہر اور بالخصوص مملکت اسلامیہ کے پایۂ تخت وغیرہ نے کتب خانوں کے قیام وحفاظت میں ایسا مثالی کردار ادا کیا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی پورے عالم اسلام میں ایسے مدارس بہت کم تھے جن کے پہلو بہ پہلو کتب خانہ نہ ہو اور بہت کم ایسے چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے جن میں کوئی چھوٹا سا کتب خانہ نہ ہو۔

عام کتب خانے امراء، خلفاء، اصحاب ثروت اور علماء قائم کرتے تھے جن کے لیے علیحدہ خاص عمارت تعمیر کی جاتی تھی، بسا اوقات اس عمارت کو مساجد اور بڑے مدارس سے ملا دیا جاتا تھا، یہ خاص عمارتیں کشادہ ہالوں پر مشتمل ہوتی تھیں، کتابیں دیواروں پر لگی الماریوں میں رکھی جاتی تھیں، ہر فن کے لیے ایک علیحدہ کمرہ ہوتا تھا، ایک کمرے میں فقہ تو دوسرے میں طب کی کتابیں ہوتیں، اسی طرح ادب اور دیگر فنون کی کتابوں کے لیے علحدہ کمرے ہوتے تھے، پھر مطالعہ

(۱) مثال کے طور پر صرف اگر عربی کی بہت مشہور کتاب کلیلہ دمنہ کا تذکرہ کیا جائے جس کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ اصلاً یہ سنسکرت کی کہانیاں تھیں پھر ان کو فارسی میں منتقل کیا گیا پھر عبداللہ بن مقفع نے اس کو عربی زبان کا ایسا خوبصورت پیرہن عطا کیا کہ وہ فصاحت وبلاغت اور اسلوب ادبی وانشاء پردازی کا مخزن قرار پائی، زبان سیکھنے کے لیے آج بھی اس کو پڑھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔(طارق)

کرنے والوں کے لیے الگ ہال، کتابت کرنے والوں کے لیے علٰحدہ جگہ ہوتی جہاں وہ بیٹھ کر کتابیں نقل کیا کرتے تھے، بعض کتب خانوں میں تو موسیقی کے لیے بھی خاص کمرے ہوتے، جہاں مطالعہ کرنے والے نشاط اور تفریح کے لیے تھوڑی دیر جا کر بیٹھ جاتے، اسی طرح کتب خانوں میں تدریس کے حلقوں، مناقشہ کی مجلسوں کے لیے علیحدہ کمرے ہوتے تھے جہاں ان کتب خانوں سے متعلق ارباب علم علمی مناقشہ کیا کرتے تھے، سارے کتب خانوں میں آرام دہ اور شاندار فرش بچھایا جاتا تھا، بعض کتب خانوں میں تو وہاں آنے والوں کے لیے کھانے کے کمرے بھی الگ ہوتے تھے، غرباء کے لیے علیحدہ جگہ ہوتی تھی جیسے کہ بغداد میں کتب خانہ یحیٰ بن نجم تھا، اس کو خزانۃ الحکمۃ اور دار العلوم کا نام بھی دیا جاتا تھا اس کو ابو القاسم جعفر بن محمد بن حمدان الموصلی نے قائم کیا تھا۔

مشہور کتب خانوں میں قاہرہ میں فاطمی خلفاء کا کتب خانہ تھا، یہ کتب خانہ بڑا عجیب وغریب تھا جس میں بڑے نفیس مصاحف، عمدہ کتابیں اور نادر مخطوطے موجود تھے، مورخین کی روایت کے مطابق اس میں ۲ ملین کتابیں تھیں جو کہ نحو، فقہ، لغت، حدیث تاریخ، روحانیت، کیمیاء، انجینیر نگ، فلسفہ وفلکیات سے متعلق تھیں۔

قاہرہ کا کتب خانہ دار الحکمۃ بھی مشہور کتب خانوں میں تھا، اس میں بڑا بہترین فرش بچھا دیا گیا تھا، اس کے تمام دروازوں پر پردے ڈالے گئے تھے، اس کے نگراں اور فراش وغیرہ سب متعین تھے، اس میں ۴۰ خزانے تھے اور ایک خزانے میں ۱۸۰۰ کتابیں علوم قدیمہ پر مشتمل تھیں، لکھنے پڑھنے کے لیے تمام لوگوں کو آنے کی اجازت تھی، یہی نہیں بلکہ وہاں روشنائی، دوات، قلم اور اوراق کا بھی آنے والوں کے لیے نظم کیا گیا تھا۔

ان مشہور مکتبوں میں بغداد کا دار الحکمۃ تھا جس کو ہارون الرشید نے قائم کیا تھا لیکن ترقی کے معراج کمال تک وہ مامون کے عہد میں پہنچا، بیت الحکمۃ میں اصلا نقل وترجمہ کا کام ہوتا تھا، تدریس وتالیف کا بھی وہاں اہتمام تھا، لوگ نہ صرف مطالعہ کے لیے جمع ہوتے بلکہ کتابوں کی نقل کا کام کرنے اور علمی مناقشوں کے لیے وہاں آتے تھے، ہارون وما مون رشید کو انقرہ، عموریہ اور قبرص کی فتح میں جو کچھ علمی چیزیں ہاتھ آئیں بیت الحکمۃ کے مترجمین ان کا ترجمہ کرتے تھے اور ان کو نقل کرتے تھے، مامون نے جب بادشاہ روم پر فتح حاصل کی تو شرائط صلح میں ایک شرط یہ بھی رکھی کہ وہاں کے علمی خزانوں میں جو کچھ بھی کتب موجود ہے ان کا ترجمہ کرنے کی ان علماء کو اجازت ہوگی جن کو مامون کی جانب سے وہاں بھیجا جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، یہ بھی تاریخ کی عجیب وغریب اور مہتم بالشان روایت ہے کہ ایک غالب آنے والے حاکم کی نظر میں کامیابی کی اس سے بڑی کوئی قیمت نہیں کہ وہ علمی خزانوں کو اپنی قوم اور اپنے ملک تک پہنچا دے۔(۱)

مشہور اسلامی کتب خانوں میں اندلس کا مکتبہ الحکم

---

(۱) عجیب بات یہ ہے کہ تاریخ میں ایسی عدیم المثل شرط صلح اور علمی ترقی پر توجہ کرنے کی بہترین مثال موجود ہے، لیکن ہمارے یہاں خلفاء وحکام کی ایسی کوششوں کو اجاگر کرنے کا وہ اہتمام نہ ہوا جو ہونا چاہئے، خود ہندوستان میں سلاطین وحکام کی تہذیبی وثقافتی کوششوں، مدارس ومساجد کی تعمیر اور...>>

تھا، یہ کتب خانہ انتہائی درجہ وسیع اور عظیم تھا اس کو حکم المنتصر بن الناصر نے قائم کیا تھا، اس نے دنیا کے دور دراز علاقوں سے یہاں کتابیں فراہم کی تھیں، بلکہ اس نے وہ کتابیں جمع کیں جو پہلے دستیاب نہیں تھیں، اس کی فہرستیں بھی انتہائی دقت نظر اور نظم ونسق کے ساتھ تیار کی گئی تھیں، صرف شعراء کے شعری دواوین جو اس مکتبہ میں موجود تھے ان کی فہرست ۱۴۴ اجزاء پر مشتمل تھی، مورخین نے ذکر کیا ہے کہ اس کتب خانے میں چار لاکھ کتابیں تھیں۔

امراء حکومت اور اصحاب ثروت نے اندلس میں متعدد کتب خانے قائم کئے ، مورخین کے مطابق صرف غرناطہ میں ۷۰ کتب خانے تھے جن میں خاص بھی تھے اور عام کتب خانے بھی تھے، کتابوں سے شغف اندلس کے باشندوں کی خاص خصوصیت تھی ، وہاں کتابوں کو جمع کرنا وجاہت ووقار کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔

اسلامی مملکت کے مشہور عام کتب خانوں میں مکتبہ بن عمار تھا جو کہ طرابلس میں قائم کیا گیا تھا، یہ اپنی عظمت اور کتابوں کی کثرت میں مثال تھا، وہاں ۱۸۰/افراد کتابوں کو منتقل کرنے پر معمور تھے، اس کتب خانے میں کئی ملین کتابیں تھیں۔

عالم اسلام کے مشرقی ومغربی علاقے میں خاص کتب خانوں میں فتح بن خاقان متوفی ۲۴۷ھ کا کتب خانہ تھا، اس طرح ابن الخشاب متوفی ۵۶۷ھ، جمال الدین القفطی متوفی ۶۴۶ھ، حلب میں ابن جرادۃ العلماء اور الموفق بن المطر ان دمشقی ۵۸۷ھ کے خاص کتب خانے بھی قابل ذکر ہیں۔

ان کتب خانوں کے علاوہ مدارس، اسپتالوں، اور مسجدوں کے زیر انتظام جو کتب خانے قائم کیے گئے تھے ان کی تعداد بھی خاصی ہے، ان میں ایسے کتب خانے بھی تھے جو بڑے کتب خانوں سے کم نہ تھے، پھر علماء کے خاص اپنے لیے ذاتی کتب خانے تھے، صرف صاحب بن عباد کی اپنی ذاتی کتابیں ۴۰/اونٹوں پر لادی جاتی تھیں۔

ہر عام کتب خانے میں دیکھ ریکھ کرنے والوں، کتابوں کی حفاظت کرنے والوں، ذمہ داروں کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاروں ، کتابیں نقل کرنے والوں، جلد سازوں کا تقرر کیا جاتا تھا، ہر چھوٹے بڑے مکتبہ میں فہارس ہوا کرتی تھیں جو کتابوں سے استفادے میں سہولت کے پیش نظر تیار کی گئی تھیں، ان کو علم کی طرح ہی ابواب کی تقسیم پر ترتیب دیا گیا تھا، کتب خانوں سے استفادہ کرنے کے لئے عام لوگوں میں سے جب کوئی کتاب باہر لے جانا چاہتا تو اس کو ضمانت دینی پڑتی تھی، جب کہ علماء اور اصحاب فضل سے اس طرح کی کوئی ضمانت نہیں لی جاتی تھی، کتب خانوں پر جو مال صرف ہوتا تھا اس کا ذریعہ یا تو وہ اوقاف ہوتے تھے جن کو خاص ان ہی کتب خانوں کے لیے وقف کیا جاتا تھا یا پھر امراء اور اہل ثروت کے عطیات سے ان کا انتظام ہوتا تھا۔

☆☆☆

...>> علمی روایات کو عام کرنے میں بڑی کوتاہی کی گئی جس کے سبب عوام الناس کے ذہنوں میں ان کی جو تصویر متعصبین نے بنائی وہ اسی کو اصل سمجھتے ہیں، یہ بات الگ کہ جتنا کام کرنا چاہئے انھوں نے نہیں کیا اور سب لوگ تعمیری کام ہی کرنے والے ہوں ایسی مثال بھی کہیں نہیں ملتی۔ (طارق)

تاریخ کے جھروکوں سے

اورنگ زیب کا وصیت نامہ (آخری قسط)

مصنف: ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد

مترجم: فیضان رشید

(۱) مذہب سے غافل گنہ گار یعنی اس ناچیز کے کپڑے اور دری کو صدقہ کر کے حسن کی متبرک قبر کو ڈھانک دینا کیوں کہ بحر بیکراں میں ڈوبے ہوؤں کے لئے عفو اور رحم کے اس عظیم باب میں داخل ہو کر پناہ لینے کے علاوہ عافیت حاصل کرنے کا اور کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ اس انتہائی متبرک کام کو انجام دینے کے ذرائع اور اسباب میرے عزیز بیٹے شہزادہ عالی جاہ (محمد اعظم) کے پاس ہیں، انہیں حاصل کرلو۔

(۲) میری سی ہوئی ٹوپیوں کی قیمت میں سے چار روپیہ دو آنہ مہالدار آیا بیگا کے پاس ہیں، اس رقم کو لے کر اس بے سہارا انسان پر چادر ڈالنے میں صرف کرو۔ میرے ذاتی خرچ کی تحصیل میں قرآن نقل کرنے کے محنتانے کے تین سو پچاس روپیہ ہیں۔ میری موت کے دن انہیں فقیروں میں تقسیم کر دینا۔ چونکہ شیعہ فرقہ قرآن کو نقل کر کے رقم کرنے کو ناجائز سمجھتا ہے۔ اس لئے اس رقم کو میرے کفن کی چادر یا تکفین کی دوسری ضرورتوں پر خرچ نہ کیا جائے۔

(۳) شہزادہ عالی جاہ کے گماشتہ سے (میری آخری رسوم تجہیز و تکفین کے لئے) ضروری چیزیں لے لینا کیوں کہ میرے لڑکوں میں میرا قریب ترین جانشین ہے اور اس پر خلاف مذہب یا مذہب کے مطابق میری آخری رسوم کو ادا کرانے کا میرا پورا استحقاق ہے۔ یہ بے سہارا متنفس اپنے بعد سے متعلق کاموں کے لئے جواب دہ نہیں اس لئے کہ مردہ شخص زندہ لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

(۴) مذہب کی راہ چھوڑ کر گمراہی کی وادی میں بھٹکنے والے مجھ آوارہ کو ننگے سر دفنانا کیوں کہ شہنشاہِ کبیر (خدا) کے حضور سر برہنہ حاضر ہونے والا ہر ایک گناہگار یقیناً رحم کا مستحق قرار پاتا ہے۔

(۵) میرے جنازہ کو چار پائی پر رکھنے کے بعد گزی کے کپڑے سے ڈھانکا جائے۔ چاندنی تاننے، گلوکاروں کا جلوس نکالنے اور رسول اللہ کا یوم ولادت منانے وغیرہ، خلاف مذہب نئی رسموں سے گریز کرنا۔

(۶) حکومت کے حاکم یعنی میرے جانشین کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ وہ اس شرمسار اور گناہگار کی خدمت کے بطور (جنوب کے) ریگستانوں اور ویرانوں میں بھٹکتے رہنے والوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے۔ اگر براہِ راست

ان سے جرم کا ارتکاب ہو بھی جائے تو فراخدلی سے نظر انداز کردیا جائے۔

(۷) لیکھ پال (پٹواری) کے کام کے لئے ایرانیوں سے بہتر کوئی قوم نہیں ہے۔ شہنشاہ ہمایوں کے زمانہ سے تاحال اس برادری کا کوئی فرد جنگ سے منہ موڑ کر نہیں بھاگا اور ان کے پائے استقامت میں کبھی لرزش نہیں آئی۔ اس کے علاوہ کبھی حکم عدولی یا بداعتمادی کے قصوروار نہیں ہوئے لیکن ان کے ساتھ نباہ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے اس لئے کہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ نہایت عزت و احترام کا برتاؤ کیا جائے۔ تمہیں کسی بھی طرح انہیں مطمئن رکھنا ہے۔ اگر اس کے لئے پالیسی کو بھی کام میں لانا پڑے تو نامناسب نہ ہوگا۔

(۸) تورانی ہمیشہ سپاہی رہے ہیں۔ یہ لوگ پیش قدمی، چڑھائی، شب خون اور گرفتاریاں کرنے میں مشتاق ہوتے ہیں۔ جب انہیں کسی لڑائی کے دوران واپسی یعنی پیر پیچھے کھینچنے کا حکم دیا جاتا ہے اس وقت وہ کسی شک، نا امیدی یا شرم کا احساس نہیں کرتے۔

ہندوستانی تو اپنا سر دینا پسند کریں گے لیکن لڑائی میں اپنی جگہ سے جنبش نہیں کھائیں گے۔ تمہیں اس قوم پر ہر طرح مہربان رہنا چاہیے۔ کیوں کہ کئی موقعوں پر جب کہ کوئی دوسری قوم ضروری خدمات کرنے میں ناکام رہے گی یہ قوم اس کی تکمیل کردے گی۔

(۹) بارہہ کے سید دعاؤں اور نیک خواہشات کو پیش کرنے والے ہیں۔ تمہیں ان کے ساتھ قرآن کی آیت ''پیغمبر کے قریبی رشتہ داروں کو اس کا منصفانہ حصہ ادا کرو'' کے مطابق سلوک کرنا چاہیے۔ قرآن میں ایک آیت ہے: میں کہتا ہوں کہ اس کے لئے تم سے اپنے رشتہ داروں سے محبت کرنے کے علاوہ اور کوئی بدلہ نہیں چاہتا۔ اس بنا پر تمہیں سمجھنا چاہیے کہ اہل بیت سے محبت کرنے کا مطلب (رسول خدا) رسول اللہ کو ان کی مساعیِ جمیلہ کا نذرانہ (بدلہ) پیش کرنا ہے۔ تم ان کے احترام کرنے میں کبھی کسر نہ کرنا، اس سے تمہیں دنیا اور آخرت دونوں جہان میں فائدہ ہوگا۔ لیکن بارہہ کے سیدوں سے معاملات میں بہت چوکنا رہنا چاہیے۔ دل و جان سے انہیں چاہنا لیکن ان بارہہ کے عہدہ کو بڑھانا بھی مت ورنہ وہ حکومت میں انتہائی بااثر شریک بن جائیں گے، صرف یہی نہیں وہ اپنے لئے حکومت ہی کی مانگ کرنے لگیں گے۔ اگر حکومت کی تھوڑی بہت لگام تم انہیں ہاتھ میں لے لینے دو گے تو انجام کار تمہیں بے عزت ہونا پڑے گا۔

(۱۰) جہاں تک ممکن ہو مملکت کے حکمراں کو گردوپیش و دور دراز کے دوروں سے گریز نہیں کرنا چاہیے، ایک مقام پر قیام بظاہر آرام کا باعث ہوتا ہے، لیکن بطور ثمرہ ہزار مصائب اور آلام کا بار اس کے اوپر آن پڑتا ہے۔

(۱۱) اپنے بیٹوں پر کبھی اعتماد مت کرنا نہ اپنی زندگی میں ان سے شیر و شکر ہونے کا رویہ اختیار کرنا۔ اگر شہنشاہ شاہ جہاں نے داراشکوہ کے ساتھ تعلق کا برتاؤ نہ کیا ہوتا تو اس کے معاملات اس درجہ کبھی خراب نہ ہوتے۔'' بادشاہ کے قول (وعدہ) ہمیشہ بے معنی ہوتے ہیں'' اس نکتہ کو ہمیشہ

دھیان میں رکھنا۔

(۱۲)مملکت کے حالات سے اچھی طرح باخبر رہنا حکمرانی کی خاص بنیاد ہے۔ایک لمحہ کی غفلت برسوں کی تذلیل کا باعث بن جاتی ہے۔میری غفلت ہی کی وجہ سے بد بخت شیواجی چھوٹ کر بھاگ گیا اور اسی کے نتیجہ میں مجھے اختتام حیات تک مرہٹوں کے خلاف سخت جدوجہد کرنا پڑی ہے۔

اپنے بیٹے شہزادہ معظم بہادر شاہ کو قید سے رہا کرتے وقت اورنگ زیب نے یہ نصیحت کی:

''ہر ایک بادشاہ کو نرمی اور سختی کے درمیان قائم رہنا چاہیے۔اگر دونوں مین سے ایک وصف دوسرے سے بڑھ جاتا ہے تو وہ اس کے تخت وتاج کی بربادی اور خاتمہ کا سبب بن جاتا ہے۔نرمی کی زیادتی ہونے پر لوگ برابری کا اظہار کرنے لگتے ہیں اور اگر سختی میں اضافہ ہوجائے تو لوگ خوفزدہ ہوکر دور بھاگنے لگتے ہیں۔مثال کے طور پر میرے چچا الغ بیگ اگر چہ بڑے قابل اور بہت سی خوبیوں سے آراستہ تھے مگر خون بہانے میں اتنے بے جھجک تھے کہ معمولی معمولی خطاؤں پر بھی سزائے موت دے دیا کرتے تھے۔ان کے بیٹے عبداللطیف نے انہیں قید کرلیا اور نہاوند قلعہ میں بھیج دیا۔راستہ میں انہوں نے ایک آدمی سے پوچھا''میری شاہی طاقت (اقتدار) کے خاتمہ کا تمہاری رائے میں کیا سبب ہے؟'' اس آدمی نے جواب دیا ''تمہارا خون بہانا جس کی وجہ سے لوگ تم سے بچنے لگے''۔ میرے محترم جدامجد شہنشاہ ہمایوں نے طرح دینے،معاف ودرگزر کرنے اور امور سلطنت میں نامناسب حد تک نرمی کا مظاہرہ کیا، حالانکہ صوبہ بنگال میں شیر خاں کے قابل اعتراض حرکات وسکنات کے بارے میں بار بار سننے کے باوجود وہ اس کو طرح دیتے رہے،اور صرف اس کے باپ حسن سور کو یہ کہہ کر ڈانٹتے رہے کہ''تم اپنے بیٹے کے کارناموں کو جانتے ہو پھر بھی تم اسے روکنے کے لئے کچھ نہیں لکھتے'' حسن نے جواب دیا ''اس کے کام لکھنے (روک تھام یا سمجھانے بجھانے) کی کیفیت سے آگے بڑھ چکے ہیں،میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضور والا کی نظر اندازی کا کیا انجام ہوگا''۔

اشعار (ترجمہ):''بادشاہ اور پانی دونوں کے لئے ایک مقام پر ٹھہرے رہنا بہت برا ہوتا ہے۔پانی سڑ جاتا ہے اور بادشاہ اپنی کثیر حمایت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔دور دورے میں رہنے سے ہی بادشاہوں کا اعزاز،اطمینان اور اقتدار قائم رہتا ہے۔چٹائی بُننے والے کو لوہار کے کام کا حکم دینا سمجھداری سے باہر کی بات ہے''۔

اپنے بیٹے شہزادہ معظم کو اورنگ زیب نے لکھا:

''لازمی سمجھ کر بہ سبب مجبوری میں نے تمہیں چند سال تک قید خانہ میں رکھ کر تمہارے انتہائی تباہ کن چال چلن کے لئے تمہیں سزا دی ہے، اس کے باوجود تم اس بات سے مستقبل میں اپنا بادشاہ ہونا طے سمجھو کہ اپنی زندگی میں ہی میں نے تمہیں جنت نشان ہندوستان کی صوبہ داری دی ہے''۔

☆☆☆

راہِ عمل

عصر حاضر کے تقاضے اور
مسلم نوجوانوں کی ذمہ داریاں

عتیق الرحمٰن (ناظم وحدانی نظام تعلیم فورم پاکستان)

عصر قدیم کا جائزہ:

چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کا معاشرہ بے شمار بیماریوں میں لت پت ہو چکا تھا، مثلاً اس وقت ان کے پاس کوئی رہبر و پیامبر نہیں تھا بس جس فرد کے من میں جو آتا وہ اس کو کر گذرتا تھا۔ اس معاشرہ میں بسنے والے اپنے متعلقین خواہ ان سے کتنا ہی بڑا خونی رشتہ نہ ہو اس کی تمیز کیے بنا وہ ان کے حقوق کو غصب کرتے ہوئے اپنی ذاتی منفعت و استراحت کے لیے سب کچھ کر گذرتے تھے۔ اس معاشرے کو جن مسائل کا سامنا تھا ان میں سے ایک اہم مسئلہ ملت کی مجموعی فلاح و بہتری کی سوچ و فکر کرنے والا کوئی فرد موجود نہ تھا۔ اس معاشرے میں بھی بہت سے افراد انفرادی طور پر روحانی زندگی بسر کر رہے تھے ماسبق کتب کی روشنی میں اسی بات کو بیان کرتے ہوئے قرآن مجید نے کہا ہے "لیسوا سواء من اهل الكتاب امة قائمة يتلون ايٰت الله انا اليل وهم يسجدون، يؤمنون بالله واليوم الآخر ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويسارعون فی الخيرات واولٓک من الصالحين." سب یکساں نہیں (انہی) اہل کتاب میں ایک جماعت قائم ہے (اس بات پر کہ) یہ لوگ اللہ کی آیتوں کی تلاوت اوقات شب میں کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں، یہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور اچھی باتوں کی طرف دوڑتے ہیں یہی لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں۔ (سورہ آل عمران آیۃ 113-114) اس سے معلوم ہوا کہ بہت سے ایسے افراد اس معاشرے میں موجود تھے جو ذاتی اور انفرادی طور پر صالح الاعمال اور سلیم العقل تھے۔ مگر افسوس کہ وہ بحیثیت اجتماعی، بہتر انسانی معاشرے کے قیام سے یا تو عاجز تھے یا انہوں نے اپنے نیکوکار ہونے پر اکتفا کر لیا تھا۔

بعثت خاتم النبیینﷺ و امت آخرۃ

ساتویں صدی عیسوی کے اس انسانی معاشرے کی ان تمام کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے کوئی مناسب و مؤثر قیادت میسر نہ آرہی تھی ایسے میں اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو یہ شرف بخشا کہ نبی مکرم رسول معظمﷺ کی بعثت اور آخری امت کی بعثت فرمائی۔ مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں کہ ''ساتویں صدی میں جس خلا کو پوری

صلاحیت اور قدرت کے ساتھ ملت اسلامیہ نے پر کیا تھا، وہ عالمی قیادت کا خلا تھا۔اس خلا کا پر ہونا امت اسلامیہ کی بعثت کا کرشمہ ہے، جس کا ایک ایک فرد مینارہ نور، حامل ایمان ویقین تھا، جس نے ظلمتوں میں اپنی راہ پیدا کی (زمانے کا حقیقی خلاء 17)''امت اسلامیہ کی بعثت یعنی بھیجے جانے کے بہت سے ثبوت قرآن وحدیث میں موجود ہیں یہاں اختصار کے پیش نظر اتنا عرض کروں گا کہ آنحضرتﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت ربعی ابن عامرؓ فارس کے بادشاہ رستم کے دربار میں اسلام کا پیغام امن وآشتی لے کر جاتے ہیں تو اس پر رستم نے آپؓ سے سوال کیا کہ وہ کون سی بات ہے جس نے آپ کو اپنے علاقہ ترک کر کے یہاں آنے مجبور کیا؟ تو حضرت ربعی ابن عامرؓ نے جواب میں جو الہامی کلمات کہے وہ سونے سے نقش کرنے کے قابل ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں کوئی جاہ ومنزلت، دولت کی لالچ یا حکومت کرنے کا شوق یہاں کھینچ کر نہیں لایا بلکہ ''یہاں اللہ نے ہمیں بھیجا ہے تاکہ جس کو وہ چاہے اس کو بندوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی میں داخل کریں، اور دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت میں داخل کریں، اور مذاہب وادیان کی زیادتیوں سے نجات دلا کر اسلام کے انصاف میں داخل کریں''اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ دین اسلام نے جانوروں سے بھی بدتر معاشرے کی قیادت سنبھالی اور ان کی اصلاح وفلاح کا علم لہرایا۔یہ اسلام ہی کا امتیاز ہے، اسلام کے اس امتیاز کو جاننے کے لیے اولین اسلامی حکومتوں کے حالات کو تفصیل سے پڑھا جا سکتا ہے۔

عصر حاضر کے مسائل

عصر قدیم کا معاشرہ جس طرح بے پناہ امراض کے سبب متعفن ہو چکا تھا آج عصر حاضر کی صورتحال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔آج معاشرے کا ہر فرد اپنی انفرادی دنیوی زندگی اچھی سے اچھی بسر کرنا چاہتا ہے، وہ بنا کسی تمیز و چھان بین کے تمام وسائل مادیہ کا جائز وناجائز استعمال کر کے اپنی ذاتی زندگی بہتر اور اچھی بسر کرنا چاہتا ہے۔ یعنی اچھی گاڑی، اچھا گھر، بینک بیلنس، سماج میں بڑا عہدہ و بڑا نام، یہ سب کچھ حاصل کرنے کی فکر میں منہمک ہے۔اگر چہ یہ امر اسلام کی نظر میں مکمل طور پر معیوب نہیں ہے ہاں البتہ اسلام اتنی دعوت فکر ضرور دیتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے جو وسائل حاصل کیے ہیں ان کے حصول کا واسطہ و طریقہ جائز ہونا چاہیے اور دوسرا یہ کہ اگر آپ کو اللہ نے آپ کی محنت کی بدولت عنایات وعطایات سے نوازا ہے تو ایسے میں اللہ کے احسان مند رہیں اپنی اس کامیابی کو ذاتی تفاخر و بالادستی کے لیے استعمال نہ کریں، اور اسی طرح اپنے حلال مال کو خرچ کرنے میں اسراف وتبذیر سے احتراز کریں۔اور سب سے بڑھ کر اپنی زندگی کے مکمل ضابطہ حیات میں اس اللہ واحد کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیں جس کی عنایات کی بدولت آپ دنیا میں بہتر زندگی گزارنے کے قابل ہوئے ہیں۔

میں اس مقام پر عصر حاضر میں ملت اسلامیہ کو

درپیش مسائل ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ویسے تو مسائل کی بہت طویل فہرست ہے مگر اختصار کے پیش نظر میں چند اہم مسائل کی جانب اشارہ کروں گا۔اولاً قیادت کا فقدان ثانیاً مادیت میں غلو پر مبنی سوچ وفکر، ثالثاً ذمہ داری کا عدم احساس، رابعاً اخلاقی پستی، خامساً اجتماعیت کی عدم دستیابی اورسادساً عصر حاضر کی ضرورتوں سے ناواقفیت۔

1: قیادت کا فقدان

جیسا کہ میں ماسبق میں ذکر کر چکا ہوں کہ اسلام کی آمد کا مقصد ہی انسانیت کو بہترین، پاک صالح، خداترس اور انسان دوست اور اللہ تعالیٰ سے خشوع وخضوع رکھنے والی قیادت کی فراہمی تھی۔اسلام نے انسانیت کو جو قیادتیں فراہم کیں ان کی مثالیں پیش کرنے کی آپ کے سامنے اگر چہ ضرورت نہیں مگر بطور یاد ہانی کہ چند شخصیتوں کی مثال پیش کرتا ہوں۔آنحضرت ﷺ کے جانشین اول سیدنا صدیق اکبرؓ نے منصب خلافت سنبھالتے ہی جو خطبہ دیا تھا وہ انسان دوستی پر مبنی تھا اس میں آپؓ نے فرمایا تھا کہ میرے نزدیک آپ میں سے طاقتور اس وقت تک کمزور ہے جب تک میں غریب کا حق اس سے نہ لے لوں اور آپ میں سے کمزور اس وقت تک میرے نزدیک طاقت ور ہے جب تک میں اسکو طاقت ور سے اسکا حق نہ دلا دوں'' دین اسلام سے محبت آپؓ میں بدرجہ اتم موجود تھی۔آپؓ نے جب وفات النبی ﷺ کے بعد فتنوں کو دیکھا اور ان فتنوں کی سرکوبی کرنے کا ارادہ کیا تو سیدنا عمرؓ نے مشکلات ومسائل کی جانب توجہ دلائی، اس وقت آپؓ نے فرمایا کہ ''اینقض الدین وانا حی'' کہ (انسانیت کے عالمگیر اور متوازن نظام حیات یعنی) دین اسلام میں کمی کی جائے اور میں زندہ ہوں یہ امر محال ہے۔سیدنا عمر فاروقؓ جن کے زمانہ خلافت میں فتوحات فارس وروم کی شکل میں اسلام کی سلطنت میں اضافہ ہوا۔خشیت الٰہی اور احساس ذمہ داری ان میں اس قدر رچی بسی تھی کہ وہ فرماتے تھے کہ ''دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر جائے تو کل روز قیامت عمرؓ اللہ کو کیا جواب دے گا'' اسلام کے پیام عالمگیر کو دنیا بھر میں پہنچانے کے لیے اپنی جدوجہد صرف کرنے والے حضرت عقبہ بن نافعؓ نے فرمایا تھا کہ یہ سمندر حائل نہ ہوا ہوتا تو میرا قافلہ برابر چلتا چلا جاتا یہاں تک کہ آخری کنارے تک میں اسلام کا پیغام آفاقی پہنچا چھوڑتا۔عصر حاضر کا سب سے بڑا چیلنج جس سے مسلمان برسرپیکار ہیں وہ قیادت کی عدم دستیابی ہے۔عالم اسلام کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی دولت سے نواز رکھا ہے مگر باوجود اس کے آج مسلم حکمران اغیار کی خوشنودی کے لیے اپنی تمام تر خدمات پیش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج مسلمانوں پر ذلت مسلط ہو چکی ہے۔جس اسلام نے انسانیت میں قیادت کی کمی کو دور کیا تھا آج وہ ہی قیادت کی کمی کا شکار ہیں۔

2: مادیت میں غلو پر مبنی سوچ و فکر

عصر حاضر میں جس طرف نظر ڈالی جائے وہیں پر ہر فرد، ہر جماعت، ہر قوم پر مادیت کی سوچ وفکر کا غلبہ نظر آتا ہے۔سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں کہ ''فکر بڑی

نعمت بھی ہے اور بڑا عذاب بھی۔ ہروقت گھر کی فکر، زیادہ کمائی کی فکر، دولتمند بننے کی فکر، زیادہ ترقی کرنے کی فکر، تو یہ تمام فکریں خدا کا عذاب ہیں لیکن ملت کی فکر خدا کی بڑی نعمت ہے یہ درد اللہ تعالی انہیں لوگوں کو عطا فرماتا ہے جن پر اس کا کرم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ ایسے آدمی پر رحم کھانے کے لیے کہتے ہیں کہ اسکو کسی وقت چین نہیں ہر وقت ملت کے غم میں ڈوبا رہتا ہے۔ مسلمان خدائی فوج دار ہے مسلمان کو کب فرصت، مسلمان کے لیے کہاں کا عیش (اسی جانب توجہ دلاتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا ''الدنیا سجن المؤمن ''یعنی دنیا تو مومن کے لیے قید خانہ ہے، جیسے ایک قیدی قید خانے میں زندگی تو گزارتا ہے لیکن اسے بے چینی لاحق رہتی ہے اسی طرح مومن اس دنیا میں زندگی تو گزارتا ہے لیکن اسے دار آخرت کی بے چینی لاحق رہتی ہے) مادیت میں غلو پر مبنی جو فکریں ہم پر سوار ہو چکی ہیں اسی (ملت) کی فکر کے نہ ہونے کے سبب سے ہیں اگر یہ ایک فکر نصیب میں آجائے تو سب فانی فکروں سے نجات مل جائے (ملت کے نوجوان اور ان کی ذمہ داریاں 19) ''مولانا روم نے اپنی مثنوی میں ایک عبرت آموز واقعہ تحریر کیا ہے، فرماتے ہیں کہ ''کل رات کا واقعہ ہے کہ ایک ضعیف العمر آدمی چراغ لیے شہر کے گرد گھوم رہے تھے اور اندھیری رات میں کچھ تلاش کر رہے تھے میں نے کہا حضرت سلامت آپ کیا تلاش کر رہے ہیں وہ فرمانے لگے مجھے انسان کی تلاش ہے میں چوپایوں اور درندوں کے ساتھ رہتے رہتے عاجز آ گیا ہوں۔ میرا پیمانہ صبر سے لبریز ہو چکا ہے اب مجھے ایسے انسان کی تلاش ہے جو خدا کا شیر اور مرد کامل ہو۔ میں نے کہا بزرگوار اب آپ کا آخری وقت ہے انسان کو آپ کہاں تک ڈھونڈیں گے اس عنقا کا ملنا آسان نہیں۔ میں نے بھی بہت ڈھونڈا ہے لیکن نہیں پایا۔ ان بزرگ نے جواب دیا کہ میری ساری عمر کی عادت یہ ہے کہ جب کسی چیز کو سنتا ہوں کہ وہ نہیں ملتی تو اس کو اور زیادہ تلاش کرتا ہوں ۔تم نے مجھے اب اس بات پر آمادہ کر دیا ہے کہ میں اس گم گشتہ انسان کو اور زیادہ ڈھونڈوں اور اس کی تلاش سے باز نہ آؤں (آدمیت سے بغاوت از سید ابوالحسن ندویؒ)''

3: احساس ذمہ داری

آج انسانوں بالخصوص مسلمانوں میں احساس ذمہ داری کا عنصر مفقود ہو گیا ہے۔ یوں جانا جاتا ہے کہ ہم دنیا میں بس کھانے پینے، لہو ولعب میں وقت برباد کرنے ، شادی بیاہ، سیر و تفریح کے لیے آئے ہیں اور پھر مر کر ختم ہو جائیں گے۔ آخرت کے انجام کی کسی کو کوئی فکر نہیں، کوئی نہیں جانتا بلکہ جاننا بھی نہیں چاہتا کہ اس کے پیدا کرنے کا مقصد اصلی کیا ہے کیوں کہ اگر وہ یہ جان لے گا تو اس سے ذمہ داری نبھانے کا مطالبہ کیا جائے گا اور آج کا انسان اپنا کام کرنے کو بالکلیہ تیار نہیں۔ قرآن پاک میں اللہ عزوجل نے واضح الفاظ میں انسان کی تخلیق کے مقصد کو بیان فرمادیا ہے ''وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (سورہ الذاریات 56)'' اور نہیں پیدا کیا جن اور انسان کو مگر بندگی کے لیے۔ بندگی یہ نہیں ہے کہ نماز

،روزہ، حج ادا کرلیا اور چند خوشی غمی کی رسوم کو پورا کر دیا بلکہ عربی جاننے والے سمجھتے ہیں کہ بندگی کا مفہوم بڑا وسیع ہے، انسان کی ساری کی ساری زندگی اللہ تعالیٰ کے سامنے تسلیم ہو جانا ہی کامل بندگی ہے۔اسی طرح انسان پر لازم ہے کہ وہ خود زندگی کے الٰہی ضابطہ حیات یعنی اسلام پر چلے اور اپنے قرب و جوار میں بالخصوص اور ساری انسانیت تک بالعموم اسلام کے پیغام کو پہنچانے کی جہد مسلسل کرے۔اس فرض سے ہر وہ آدمی سبکدوش نہیں ہوسکتا جو دعویدار ہے اس بات کا کہ اس نے محمد عربی ﷺ کے پیغام کو مکمل طور پر قبول کر کے اسلام کو اپنی دنیوی زندگی کا کامل ضابطہ حیات مان لیا ہے۔

4: اخلاقی پستی

زمانہ قدیم کی طرح عصر جدید کے معاشرے میں انسانوں کا باہمی تعلق مطلب پرستی اور مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے قائم ہے ۔ موجودہ دنیا کے انسان میں خداپرستی پر نفس پرستی غالب آچکی ہے ،آج کا انسان مادیت کا غلام بن چکا ہے،اس میں انسانیت کا احساس مٹ چکا ہے، ہر فرد جنسی خواہشات اور مادی ضروریات کی رو میں بہا جا رہا ہے کسی بھی وقت وہ ذرا ٹھہر کر یہ سوچنے پر تیار نہیں کہ اللہ نے اس کو معدہ و پیٹ کے ساتھ دماغ، دل اور روح بھی عطا کی ہے اور اس کی بالیدگی کے لیے لازم ہے کہ انسان اپنے اخلاقی اوصاف کو درست کرے اپنے دل میں پوری انسانیت کا درد پیدا کرے کیوں کہ انسانوں کی سوچ وفکر اور ان کے عمل کا اثر پوری کائنات کے اخلاق اور معاملات پر پڑتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو معلم اخلاق بنا کر بھیجا تھا۔قرآن میں ارشاد ہے ’’انک لعلیٰ خلق عظیم‘‘ یعنی آپ ﷺ کا اپنا فرمان ہے کہ ’’انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق‘‘ کہ میں اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

5: اجتماعیت کی عدم دستیابی

موجودہ معاشرے کو ایک اہم عنصر جو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے وہ باہمی اتحاد و یگانگت کی عدم دستیابی ہے۔موجودہ معاشرہ متعدد طبقوں میں بٹ چکا ہے یعنی ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔اسی سبب سے دشمنان اسلام ہمیں گاجر مولی کی طرح کاٹتے جا رہے ہیں۔کیوں کہ اتحاد و اتفاق میں برکت ہے چرند، پرند، حیوان اور انسان میں سے جو بھی اس کو اپنا لے اس میں فطرتی طور پر قوت و طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور دشمن کے دل میں انکا خوف گھر کر جاتا ہے۔اسلام نے مسلمانوں کو باہمی اتحاد و اتفاق اور آپس میں بھائی چارگی کی فضا پیدا کرنے کی دعوت دی ہے اور اس پر ریاست اسلامیہ مدینہ میں آپ ﷺ نے انصار و مہاجرین میں مواخات مدینہ قائم کر کے عملی ترغیب دی۔اسلام کے دامن عافیت میں پناہ لینے والے تمام افراد کو یکساں حیثیت مل جاتی ہے، شخصی امتیازات کے سبب مراتب کی درجہ بندی تو ہوسکتا ہے مگر بحیثیت مسلم ان میں کسی قسم کی تقسیم روا نہیں رکھی یہ امر سنت باری تعالیٰ ہے کہ اللہ نے صحابہ کرامؓ کا تذکرہ فرماتے ہوئے ہمیشہ جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔کہ یہی

لوگ کامیاب ہیں یہی لوگ راشد ہیں، یہی لوگ مومن ہیں وغیرہ مگر افسوس آج ہم مسلمان ہوتے ہوئے بھی اسلام کے پیغام کو ملکی، سیاسی، مذہبی، صوبائی، لسانی، قومی عربی و عجمی جیسی تقسیمات میں بانٹ کر ملت کی اجتماعیت پر شب خون مار چکے ہیں۔

6: عصر حاضر کی ضرورتوں سے ناواقفیت

موجودہ دور میں ایک اور امر جس کا ہم مسلمانوں کو سامنا ہے وہ یہ کہ وقت کے تقاضوں اور ضروریات سے بے پرواہ ہو چکے ہیں۔ اس امر میں کوئی دورائے نہیں کہ اسلام تا قیامت انسانیت کی راہنمائی کے لیے آیا ہے اس پر لب کشائی کی اجازت کسی کو نہیں البتہ زمان و مکان کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اسلامی دعوت کو اسی پیرائے میں پیش کرنے کی ممانعت بھی ہرگز نہیں کی گئی۔ قرآن پاک میں بڑی صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ " ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة" کہ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت و دانائی اور موعظۃ حسنہ خوش اسلوبی کے ساتھ دعوت دیں۔ موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے، انسان چاند پر اپنی کمند ڈال چکا ہے، عمل اور تجربہ کے بنا کسی بات کو کوئی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ حضور ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کی طرح اسلام کی دعوت کو پورے عالم میں پہنچانے کے لیے دعوت کے اسلوب پر از سر نو داعیان دین غور کریں۔ آج کا معاشرہ دو حصوں میں منقسم ہے یا تو وہ عصر حاضر کے تقاضوں سے سرے سے ہی واقف نہیں اگر واقف ہے بھی تو اس سلسلے میں کام کرتے وقت حکمت و دانائی کے عطیہ سے خالی ہے اور دوسرا جو عصر حاضر کے تقاضوں سے واقف تو ہے مگر وہ مغرب کی اندھی تقلید میں ہی اپنی نجات و بھلائی محسوس کرتا ہے ہمارے معاشرے میں غالب عنصر اسی دوسرے طبقے سے ہیں۔ اس دوسرے طبقے کے زاویہ فکر کو درست کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو کام میں لانے کے لیے اور پوری انسانیت کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے میں جس امر کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اپنے اسلوب دعوت کو درست کیا جائے۔ سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں کہ انبیا کی دعوت اور اصلاحی تحریکات کی دعوت میں فرق یہ ہے کہ بعض تحریکیں اور دعوتیں ایمان بالآخرت کی ترجمانی بہت اچھی طرح کرتی ہیں اور بہت تفصیل کے ساتھ اور دلنشین انداز و طریقہ پر اس کی حکمتوں اور زندگی پر اس کے خوشگوار اثرات اور اخلاقی نظام میں اس کی اہمیت کا ذکر کرتی ہیں، لیکن ہر ذہین شخص محسوس کرسکتا ہے کہ یہ آخرت کا صرف ایک اخلاقی ضرورت اور ذریعہ اصلاح و تربیت کے طور پر استعمال ہے اس لیے کہ اس کے بغیر بہتر سماج اور صالح معاشرہ کا قیام مشکل ہے، یہ کوشش بعض وجوہ سے لائق تحسین ضرور ہے مگر انبیاء علیھم الصلوٰات والتسلیمات کے طریقہ فکر اور طریقہ عمل انکی سیرت و کردار اور ان کے خلفا و نائبین کے طریقہ زندگی سے کھلے طور پر مختلف ہیں دونوں میں فرق یہ ہے کہ انبیاء ایمان و وجدان، احساس و شعور اور ذوق و شوق کا نام ہے، وہ ایک

ایسا عقیدہ ہے کہ جو انسان کے تمام احساسات وجذبات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جبکہ اصلاحی تحریکیں اس کو قانونی حیثیت سے تسلیم کرنے کی ظاہری شکل ہے۔انبیاء آخرت کا ذکر اس وقت کرتے ہیں جب بے ساختگی ،لذت،لطف و کیفیت کو محسوس کرلیں اور اس کی دعوت بڑی قوت ،گرم جوشی،اور یقین کے ساتھ قبول کرتے ہیں دوسری جانب اصلاحی تحریکوں کے لوگ اخلاقی و سماجی ضرورت کے بقدر اسکا ذکر کرتے ہیں،اور قومی اصلاح اور اخلاقی تنظیم کے جذبہ سے اسکی دعوت دیتے ہیں۔(معرکہ ایمان ومادیت108از سید ابوالحسن ندویؒ)

مسلم نوجوانوں کی ذمہ داریاں

عصر حاضر میں نوجوانوں کی ذمہ داریاں کیا ہیں ویسے تو ان کی فہرست طویل ہے کیوں کہ تاریخ شاہد ہے کہ نوجوانوں کا کردار اور ان کی ذمہ داریاں ہر دور میں مسلم رہی ہیں اسلام کی دعوت کو عروج ملنے میں بھی نوجوانوں کا بڑا کردار ہے۔نوجوانوں کی اہمیت اسلام میں مسلم ہے اسی لیے آپ ﷺ نے اپنی حیات کے اواخر میں جس لشکر کو تیار کروایا اس کی قیادت باوجود جلیل القدر صحابہؓ بشمول سیدنا عمر فاروقؓ کی موجودگی میں اس وقت کے بمشکل اٹھارہ سالہ نوجوان حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سونپی۔دنیا میں اب تک تمام برپا ہونے والے انقلابات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں بھی انہی کا کردار عیاں نظر آتا ہے۔خود برصغیر سے انگریز کے انخلاء اور تحریک آزادی میں نوجوانوں کے کردار کو کسی صورت فراموش نہیں کیا جاسکتا۔نوجوانوں کی اہمیت کا احساس وادراک علامہ اقبالؒ میں بدرجہ اتم موجود تھا اس لیے انہوں نے اپنے کلام کا وافر حصہ نوجوانوں سے متعلق تحریر کیا،وہ فرماتے ہیں

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند

نوجوانوں کی ذمہ داریوں اور ان کے کردار پر بہت سے لوگوں نے لکھا ہے مگر سب سے زیادہ مفصل انداز میں قرآن پاک نے بیان فرمایا ہے سورہ کہف کا نام ہی ان نیک نوجوانوں کے واقعہ کی جانب اشارہ کرنے کے لیے اللہ نے رکھا کہ جو اپنا سب کچھ اللہ کے لیے قربان کر چکے تھے۔اسی طرح حضرت لقمان علیہ السلام نے قرب وفات اپنے بیٹوں کو جو نصیحت کی قرآن پاک نے واضح بیان فرمادیا حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو سات باتوں کی وصیت کی۔

ا۔توحید کی دعوت

آیۃ''واذ قال لقمان لابنه وهو يعظه لاتشرك بالله ،ان الشرك لظلم عظيم۔سورہ لقمان(15) اے میرے بیٹوں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا بیشک شرک بھاری ظلم عظیم ہے۔یعنی زندگی میں کوئی مسئلہ پیش آجائے تو اللہ کو پکارنا

ب۔الله کی ذات باریک بین هے۔

''يٰبنيى ان تك مثقال حبة من خردل فتكن فى السمٰوات والارض يأت بهاالله ان الله لطيف خبير''(سورہ لقمان16)

اے میرے بیٹے !اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر پھر وہ بھی کسی چٹان میں یا آسمان میں ہو یا زمین میں اللہ ضرور لائے گا اور بیشک اللہ باریک بین اور خبیر ہے۔

ج۔نماز قائم کرنا

''یٰبنیی اقم الصلوٰۃ''(سورہ لقمان 17)

''اے میرے بیٹو نماز قائم کرنا'' کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ سے براہ راست مدد طلب کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

د۔امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کا فریضہ

''وامر بالمعروف والنھی عن المنکر ''سورہ لقمان(17)

''نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے منع کرنا''۔یہ فریضہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتﷺ کے صدقے ملت اسلامیہ کو عطا فرمایا ہے کیوں کہ یہ امر اللہ کے نزدیک محبوب ترین ہے

ہ۔مصائب و مشکالات پر صبر کرنا

''واصبر علی ما اصابک ان ذٰلک من عزم الامور ''(سورہ لقمان 17)

جو مصیبت تم پر آ جائے اس پر صبر کرنا بیشک یہ عزیمت کے کاموں میں سے ہے۔انسان کو زندگی میں مصائب و مشکالات میں سے گذرنا پڑتا ہے تو ایسے میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔اسلام نے مشکالت پر صبر کرنے کی بڑی اہمیت بیان کی ہے۔

و۔کبر و غرور سے اجتناب کرنا

''ولاتصعر خدک للناس ولاتمش فی الارض مرحا ،ان اللہ لایحب کل مختال فخور ''(سورہ لقمان 18)

''اور لوگوں کے سامنے اپنے گال نہ پھلا،اور زمین پر اترا کے نہ چل کسی تکبر کرنے والے اور شوخی بگھارنے والے کو اللہ پسند نہیں کرتا''

ز۔رفتار و آواز میں اعتدال

''واقصد فی مشیک واغضض من صوتک ان انکر الاصوات لصوت الحمیر''(سورہ لقمان 19)

''اور اپنی رفتار میں میانہ روی پیدا کر اور آواز کو پست رکھ بیشک آوازوں میں سے بدتر آواز گدھے کی ہے''

آج کا نوجوان دنیا کی رنگینی میں مستغرق ہو چکا ہے ،مادیت کی دلدل میں دھنس چکا ہے۔وہ اپنی ذمہ داریوں سے انتہا درجہ تک غافل ہو چکا ہے لہو ولعب میں وقت گذارنے میں سکون قلبی محسوس کرتا ہے فلمیں ،ڈرامے،فیس بک اور سوشل میڈیا پر اپنا وقت برباد کرنے کو اپنی بلند ہمتی اور ترقی جانتا ہے اور بات کرنے پر وہ اس مثل کی طرح ''چور الٹا کوتوال کو ڈانٹے'' کا نمونہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم اپنی ذاتی زندگی میں بااختیار ہیں اور ہم من چاہی زندگی گذارنے میں ہم مکمل آزاد ہیں باپ،استاد،دوست اور داعی کسی کو کوئی حق نہیں کہ وہ ہمارے نجی و ذاتی معاملات میں مداخلت کریں۔لندن میں نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے حضرت سید ابوالحسن ندویؒ نے فرمایا تھا کہ ''عزیزو! آپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ آپ کو جنھوں نے یہاں بھیجا ہے ان کے لیے یہ

کافی نہیں کہ آپ اچھے سائنس دان ،اچھے ٹیکنیشن ،اچھے انجینیر ،اچھے ڈاکٹر،اچھے آرٹسٹ اور مغربی زبانوں اور ادبیات کے ماہر بن کر جائیں۔اگر آپ نے صرف سائنس دان صرف انجینیر اور صرف قانون دان بنے تو آپ نے ملک کو صحیح فائدہ نہیں پہنچایا،آپ کو ان علوم میں مجتھدانہ قابلیت پیدا کرنی چاہیے کہ اگر آپ قانون کے طالب علم ہیں تو آپ کو اسلامی قانون پر عبور حاصل کرنا چاہیے اور دنیا کے اصول قانون کا گہرا مطالعہ کرکے اسلامی قانون کی برتری ثابت کرنی چاہیے،آپ کو اپنے ملکوں میں جا کر کہنا چاہیے کہ مغرب کا کس قدر برا حال ہے وہ اس وقت پکے ہوئے پھل کی مانند ہے جو کسی وقت بھی گرنے والا ہے۔اگر آپ نے مشرق جا کر کہا کہ مغرب سرتا پا خیر ہے اور سراسر بے عیب ہے تو آپ نے اپنی قوم کو دھوکا دیا،اور ایک خلاف واقعہ بات بیان کی ،آپ کو یہاں سے واپس جا کر اپنے بھائیوں کو بتانا ہے کہ مغرب کے پاس کیا خوبیاں ہیں؟اس کی قوت کا کیا راز ہے،اور ان کی زندگی کے کون سے پہلو قابل تقلید ہیں؟اسی طرح مغرب کی کون سی بیماریاں ہیں،جو اس کو گھن کی طرح کھائی جا رہی ہیں،وہ آج کس اخلاقی جذام میں مبتلا ہے،ہمیں اس کی کن کن چیزوں سے احتراز کرنا ہے اور کون کون سی باتیں ہیں جن کی مشرق کو تقلید کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔(مغرب سے صاف صاف باتیں از سید ابوالحسن ندویؒ 58-57)میں اپنی گذارشات مغرب کے شہر آسٹریا کے مشہور عالم علامہ اسدؒ کے تجربات اور ان کی زندگی کے خلاصہ پر ختم کرتا ہوں۔انہوں نے اپنی کتاب اسلام دوراہے پر میں تحریر کیا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مغرب کی جدید تحقیق ،ریسرچ،ادب وثقافت اور ان سے سائنس ،ٹیکنالوجی ،ریاضیات وغیرہ کی تعلیم ضرور حاصل کریں مگر ان کے علم کے ساتھ ان کی تہذیب وثقافت کو ہر گز نہ لیں کیوں کہ یہ امر مسلم تہذیب کے خاتمے کا موجب بنے گا۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کو اپنی ذمہ داریوں اور شناخت کو درست طور پر تھامنے اور ان کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں جو پیغام نوجوانوں اور عامۃ الناس کو دیا گیا ہے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں یا نہ کریں مگر اپنی ذات کی بہتری کے لیے تو کچھ کر گذریں پر اپنی بات ختم کرتا ہوں

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا تو نہ بن اپنا تو بن

☆☆☆

کیا عجب معجزۂ گردش دوراں دیکھا!
بستیاں دشت میں شہروں میں بیاباں دیکھا
شہر کے شہر تعصب نے کھنڈر کر ڈالے
آگ پھر آگ تھی ہندو نہ مسلماں دیکھا

بحث وتحقیق

پہلی صدی ہجری میں ہندوستان میں ''فقہ'' کی کیفیت اور'' ذرائع علم و فقہ''

فرید حبیب ندوی

ہم نے اب تک جو کچھ عرض کیا اس کا خلاصہ یہ نکلا کہ ''فقہ اسلامی'' کا ارتقاء آہستہ آہستہ ہوتا رہا اور ہندوستان میں اسلام کی آمد عہد نبوی میں ہی شروع ہوگئی تھی، اور اسلام وفقہ کا باہم غیر منقطع رشتہ ہے، تو گویا فقہ بھی شروع میں ہی یہاں کی فضا میں داخل ہو چکا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہاں صحابہ کرام تشریف لائے، جیسا کہ ابن ابی حاتم الرازی (م ۳۲۷ھ) نے لکھا ہے(۱)، تابعین عظام کی آمد ہوئی، اور خاص کر سید التابعین حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے تو یہاں ایک مدت قیام کیا، تو یہاں کے باشندوں نے ان سے علوم کی تحصیل بھی کی ہوگی، اور چونکہ شروع میں فقہ و حدیث کی تقسیم نہیں تھی بلکہ جو صحابہ نے حاصل کیا طلباء اسی کو حاصل کرتے تھے، چاہے اس کا تعلق حدیث سے ہو یا فقہ سے، تفسیر وقرآن سے ہو یا کسی اور فن سے، بلکہ یہ سب کچھ تفقہ فی الدین میں داخل تھا۔

عہد بنوامیہ میں سرزمین عرب کے بلاد علمی میں فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم کا آغاز ہو چکا تھا، اس وقت ہندوستان کی مسلمان علمی شخصیات کی عرب اور دنیائے اسلام کے دیگر بلاد وامصار میں آمد ورفت جاری تھی جہاں وہ حدیث، تفسیر، فقہ، مغازی اور لسانی علوم کی تحصیل اس وقت کے جید علماء سے کرتے تھے، ان میں سے اکثر انہی علاقوں میں سکونت پذیر ہو گئے اور وہاں ان علوم کی ترویج واشاعت فرمانے لگے، مشہور کتب رجال مین ہندی علماء کا شمار درجہ اولی میں ہوتا ہے، ابوالعباس احمد بن محمد الدیبلی المصری الشافعی کے بارے میں عبدالوہاب السبکی (م ۷۷۱) نے لکھا ہے''انه كان فقيهاً جيدا المعرفة تفقه على مذهب الشافعي''(۲)

اس زمانہ میں مساجد قائم تھیں تو علمی حلقے بھی قائم ہوتے ہوں گے، جہاد وغیرہ نئے نئے اور عجیب وغریب حالات کے مطابق مسائل سامنے آتے ہوں گے تو اجتہاد کی بھی ضرورت پڑتی ہوگی، لیکن آج ہم ان تفصیلات کو جاننے سے عاجز ہیں، کیونکہ اس وقت کی کوئی صحیح علمی تاریخ میسر نہیں، ''چچ نامہ'' اس سلسلہ کی قدیم ومستند تاریخ سمجھی جاتی ہے،

محمد اسحٰق بھٹی صاحب ''برصغیر میں حدیث رسول ﷺ'' کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''صحابہ کرام کا ہر قول اور ہر عمل حدیث رسول اور

ارشادات پیغمبر سے ہم آہنگ تھا، وہ جہاں جاتے فرامین نبوت کے ساتھ جاتے، جن سے زندگی کے تمام نشیب و فراز میں وہ رہنمائی حاصل کرتے تھے، برصغیر پاک وہند میں بھی احادیث کا قلب نواز اور روح پرور ذخیرہ ان کے ساتھ آیا، آنحضرت کے وصال سے چار سال بعد ۱۵/ ہجری میں صحابہ کی جو جماعت یہاں آئی وہ حدیث رسول اپنے ساتھ لائی، اس طرح کہنا چاہیے کہ ۱۵/ ہجری میں اس خطے میں رسول ﷺ کی احادیث مبارکہ پہنچنا شروع ہوگئی تھیں۔

صحابہ کی مقدس جماعت کے سفر حیات کی منزلیں آنحضرت کے فرامین وارشادات کی روشنی میں طے ہوتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے طرز معاشرت کا ہر گوشہ اور اسلوب زندگی کا ہر پہلو آپ کے اسوہ وعمل کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، وہ گھر میں ہوں یا باہر، سفر میں ہوں یا حضر میں، حالت جنگ میں ہو یا امن میں، زراعت میں مشغول ہوں یا تجارت میں، ہر لمحہ اور ہر حال میں ان کے پیش نگاہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال واحادیث کا ذخیرہ رہتا تھا، یہی ان کا اوڑھنا بچھونا اور یہی سرمایۂ زندگی تھا، وہ جس ملک اور جس علاقے میں گئے اور جس منصوبے کے تحت گئے حدیث رسول اپنے ساتھ لے کر گئے، برصغیر پاک وہند میں آئے تو یہ متاع بے بہا ان کے ساتھ تھی، اور انہوں نے جہاں جو قدم اٹھایا اس کی رہنمائی میں اٹھایا، (۳)

یوسف فاروقی صاحب اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں:

صحابہ کرام اور تابعین جو ہندوستان تشریف لائے یا یہاں کے باشندے جنہوں نے قرآن وسنت کا علم صحابہ اور تابعین سے حاصل کیا انہوں نے یہاں کے حالات اور ضروریات کے مطابق اجتہاد بھی کیا ہوگا، سرزمین ہند کے معاشرتی، سیاسی، معاشی، اور تہذیبی حالات ومسائل اہل عرب سے مختلف تھے، اس لئے یہاں بہت سے نئے مسائل پیش آئے ہوں گے اور ان مسائل کا حل بھی انہوں نے اجتہاد کے ذریعہ حاصل کیا ہوگا، ان کی تفصیلات کو جاننا اب بہت مشکل ہے، شاید ان کی اجتہادی آراء کو محفوظ کرنا ضروری بھی نہ سمجھا گیا ہو کیونکہ اصل زور تو قرآن وسنت کی حفاظت پر تھا (۴)

مفتی حماداللہ وحید کے بقول:

''پہلی صدی ہجری میں ہی اسلام کے لئے تقدم و ترقی کی راہیں کھل گئی تھیں اور اس نے بحر وبر کے دور دراز فاصلوں کو طے کرکے برصغیر پاک وہند کو اپنی آغوش رحمت میں لے لیا تھا، اور پھر یہاں مختلف اسلامی علوم نے اپنے لئے جگہ بنائی، مفسرین ومحدثین اور فقہاء پیدا ہوئے...... فقہاء کرام نے کتاب وسنت کے ذریعہ لوگوں کو ان نو پید مسائل کی نشاندہی کروائی اور لوگوں کو حق کی راہ بتلائی، انہی فقہاء کی شب وروز کی محنت کی وجہ سے کسی زمانہ میں برصغیر اسلامی علوم کا مرکز رہا اور یہاں بڑے بڑے فقہاء پیدا ہوئے، جنہوں نے کتابیں لکھیں اور علم فقہ پھیلایا (۵)

پہلی صدی ہجری کے اواخر میں عام طور سے جنگ جاری تھی، جس کی وجہ سے نت نئے مسائل کا سامنا ہوتا رہتا تھا اور ان کو حل کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ محمد بن قاسم

رحمہ اللہ نے اکثر مفتوحہ علاقوں میں مساجد تعمیر کرائی تھیں اور وہاں خطباء وقضاۃ کی تقرری کی تھی جن کے ذریعہ تمام مسائل حل کئے جاتے تھے، اس سلسلہ میں شمیم اختر قاسمی لکھتے ہیں:

''محمد بن قاسم نے جن علاقوں کو فتح کیا وہاں مسجدیں بنوائیں اوراس کے لئے امام وخطیب کاتقرر کیا جو حدیث کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ فقہی مسائل میں گہری بصیرت رکھتے تھے، اس مسجد کے منبر ومحراب اور صحن سے مسلمانوں کے پیش آمدہ نت نئے مسائل کے حل کے تلاش کرنے کے ساتھ قضاۃ کی خدمت بھی انجام دیتے تھے(٦)

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں عام طور سے مساجد ہی دارالعلوم کا کام کرتی تھیں، وہی مساجد علمی وفقہی مرکز کا دوسرا چہرہ اور دوسری صورت تھیں، پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے کارناموں اور علمی وفقہی مراکز کی طرف مسلمانوں کے رجحان، اوران کے علمی شغف کے بارے میں محمد اسحٰق بھٹی کا ایک طویل اقتباس ملاحظہ ہو:

''آغاز اسلام ہی میں مسلمان فاتح کی حیثیت سے برصغیر پاک وہند کے مختلف علاقوں میں آ گئے تھے، تاریخ صاف الفاظ میں وضاحت کرتی ہے کہ ان میں صحابی بھی تھے تابعی بھی تھے، تبع تابعین بھی تھے اور دیگر صلحاء واولیاء بھی، ظاہر ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے انہی ذرائع کو ہدف توجہ ٹھہرایا ہوگا جو آگے چل کر اس خطے میں فروغ دین اشاعت اسلام کا موجب بن سکیں، اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے یہی کیا، چنانچہ فتوح البلدان میں بلاذری کا کہنا ہے کہ عرب جب سندھ کے علاقے پر علم اسلام لہرانے کی غرض سے نمودار ہوئے تو سب سے پہلے جو بڑا شہران کے زیرنگیں آیا وہ دیبل تھا، انہوں نے اولین کام یہ کیا کہ وہاں مسجد تعمیر کرائی، یہ بہت بڑی مسجد تھی جو محمد بن قاسم نے تعمیر کرائی، بعدازاں عربوں نے نیروں نامی ایک شہر پر قبضہ کیا تو اس میں مسجد بنوائی جو طرز تعمیر میں دیبل کی مسجد کے مانند تھی، بقول ''چچ نامہ'' کے ''بجائے بت کدہ مسجدے بنا نمود وبانگ نماز وامام تعین فرموذ'' (چچ نامہ ص ۱۱۸) پھر شہر ارور اور ملتان کو اپنے دائرہ فتوحات میں شامل کیا تو وہاں پہلے مسجدیں تعمیر کرائیں، غرض وہ جو شہر یا علاقہ فتح کرتے گئے اس میں باقاعدہ مسجدیں تعمیر کرواتے گئے جو بہت جلد ایک عظیم علمی اور فقہی مرکز کی حیثیت اختیار کر گئیں (۷)

فقہی مسائل کے حل کرنے کا طریقہ پہلی صدی ہجری میں:

جیسا کہ بیان کیا گیا کہ مساجد کے امام وخطباء ہی فقہی مسائل کا حل بتاتے اور قضاء کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، پہلی صدی کے فقہاء کے اسماء کی فہرست دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں قضاۃ کی تعداد بھی کافی تھی، اس کا مطلب ہے کہ ''دارالقضاء'' بھی شاید قائم ہوں گے یا پھران کا کام بھی مساجد سے ہی لیا جاتا ہوگا، بلکہ غالبًا مسجدیں ہی دارالقضاء کا کام بھی انجام دیتی تھیں،

چونکہ یہ ابتدائی دور تھا اسلئے بہت سے مسائل ایسے سامنے آتے تھے جن کا جواب ہندستانی فقہاء کیلئے مشکل

ہوتا تھا، اس لئے ان مسائل میں مرکزی حکومت سے رجوع کیا جاتا تھا، اسی طرح کا ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے شمیم قاسمی ''چچ نامہ ص ۲۰۸'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''محمد بن قاسم کے سامنے پہلی بار یہ مسئلہ پیش ہوا کہ دیبل کی فتح کے بعد وہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے اور فقہاء اسلام کی صراحت کے مطابق انہیں غیر مسلموں کے کس خانہ میں رکھا جائے، اہل کتاب میں شمار کیا جائے یا شبہ اہل کتاب کے زمرہ میں رکھا جائے، یا پھر ان کا شمار ان میں سے کسی میں بھی نہ کیا جائے، اس زمانہ میں یہ مسئلہ پیچیدہ بن کر سامنے آیا مگر کوئی واضح صراحت نہ ہونے کی وجہ سے مرکزی حکومت سے رجوع کیا گیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجاج بن یوسف نے علماء سے استفسار کر کے اس کا شرعی حل معلوم کیا پھر محمد بن قاسم کو اس کی اطلاع دی، (۸) اس کی روشنی میں سندھ کے غیر مسلموں کو ''ذمی'' کا درجہ دیا گیا۔ (۹)

چنانچہ محمد بن قاسمؒ نے یہاں کے غیر مسلموں کو اہل کتاب کی سی رعایتیں دیں اور یہ سب کچھ حجاج بن یوسف ثقفی کے اشارہ وحکم سے کیا۔

''آب کوثر'' ہندستان کی علمی ومذہبی تاریخ میں ایک عظیم کتاب ہے، اس کے مصنف فرماتے ہیں:

''برصغیر پاکستان وہند میں فقہی مسائل کا آغاز اسی وقت سے ہو گیا تھا جب محمد بن قاسم اور اس کے رفقائے کار کے بابرکت قدم اس سرزمین میں پہنچے، نئی مملکت میں نو واردوں کے جو مسائل حل کرنے پڑے ان میں سب سے اہم غیر مسلم آبادی کی نسبت نئی حکومت کا نقطہ نظر تھا، مقامی سندھی یا ہندو تھے یا بدھ مت کے ماننے والے، بہر کیف سارے بت پرست تھے، وہ مصر وشام کے باشندوں کی طرح اہل کتاب نہ تھے، اس کے متعلق اسلامی قانون میں ایک واضح اور صریح اصول نہ تھا۔ لیکن عرب فاتحین نے مقامی ہندوؤں اور بودھوں کو وہ تمام رعایتیں دیں جو اہل کتاب یہودیوں اور عیسائیوں کو شریعت اسلامی میں حاصل تھیں، مقامی عبادت گاہوں کے متعلق فتوح البلدان میں محمد بن قاسم کا قول درج ہے کہ یہ بت خانے ہمارے لئے عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور مجوسیوں کے آتش کدوں ہی کی طرح ہیں، ''چچ نامہ'' میں بھی ایک جگہ یہی الفاظ دہرائے گئے ہیں بلکہ یہ بھی وضاحت ہیکہ یہ احکام حجاج بن یوسف سے استصواب کے بعد جاری کیے گئے (۱۰)

راجہ داہر کے دارالسلطنت کے بت خانے کی نسبت مقامی باشندوں نے درخواست کی کہ ہمارا بت خانہ مسمار ہو گیا ہے، امیر عادل اجازت دیں کہ اس کی تعمیر کر سکیں، اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے جو کہ ''چچ نامہ'' میں مذکور ہے مصنف مذکور فرماتے ہیں:

چونکہ معاملہ نہ صرف بت پرستی کی اجازت کا تھا بلکہ ''خراب شدہ'' بت خانہ کی تعمیر کا تھا، اس لئے امیر لشکر نے حجاج بن یوسف کو لکھ بھیجا، وہاں سے جو جواب آیا اس سے عربوں کے اس طریق کار (جو انہوں نے پہلی صدی ہجری میں یعنی ائمہ اربعہ کی تدوین فقہ سے بہت پہلے اختیار کر رکھا تھا)، پر رشنی پڑتی ہے، حجاج نے لکھا:

’’مکتوب عزیز پہنچا، احوال مندرجہ سے آگاہی ہوئی، برہمناباد کے سربرآوردہ لوگوں نے اپنے مندر کی تعمیر اور اپنی قوم کے متعلق التماس کیا ہے، جب ان لوگوں نے ہماری اطاعت قبول کر لی ہے اور دارالخلافہ کی طے کردہ رقوم کی ادائیگی کا ذمہ لے لیا ہے تو پھر ہمارا ان پر مزید حق نہیں رہتا اس لئے کہ اب وہ ذمی ہوگئے، اور ان کے جان ومال میں ہمارا کوئی تصرف نہیں، اس لئے اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے معبود کی عبادت کریں، اور کسی شخص کو اس کے مذہب کے متعلق ممانعت اور روک نہ ہوتا کہ وہ اپنے گھروں میں اپنی رائے کے مطابق رہیں، (۱۱)

حجاج اس بارے میں اس قدر حساس تھا کہ وہ ان مسائل کے بارے میں کوفہ وبصرہ کے علماء سے بھی استفسار کرنے میں حرج نہ سمجھتا تھا، مصنف مذکور کے الفاظ میں:

’’چچ نامہ میں بعض احکام کی نسبت صراحت ہے کہ حجاج نے ان کے جاری کرنے سے پہلے علماء کوفہ وبصرہ بلکہ خلیفۂ وقت سے استصواب کیا تھا، عجب نہیں کہ سندھ کے بت پرستوں کو ذمیوں کا درجہ دینے سے پہلے یہ عمل روا رکھا گیا ہو، (۱۲)

☆☆☆

حواشی:

(۱) (مقدمہ الجرح والتعدیل ص ۹ بیروت ۱۹۵۳ء) فکرونظر اسلام آباد اپریل ۲۰۱۰ء

(۲) طبقات الشافعیۃ: ۱۰۲/۳ تحقیق عبدالفتاح ابوغدۃ: قاہرہ ۱۹۶۴ء، از: فکرونظر ص ۴۳۔

(۳) برصغیر مین اسلام کے اولین نقوش: محمد اسحاق بھٹی ص ۴۶

(۴) امام ابوحنیفہ، حیات، فکر اور خدمات: یوسف فاروقی

(۵) تاریخ الفقہ والفقہاء: حماد اللہ وحید ص ۱۵۹

(۶) ترجمان دارالعلوم دیوبند، مقالہ: شمیم اختر قاسمی: بعنوان عہد اموی و عباسی کے ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم: جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء ص ۲۹۔

(۷) برصغیر پاک وہند میں علم فقہ: محمد اسحٰق بھٹی، مقدمہ: ص ۱۹-۲۰۔

(۸) تعجب کی بات یہ ہے کہ محمد بن قاسم اور حجاج یوسف ثقفی کے درمیان ہر تیسرے روز خط وکتابت ہوتی تھی،

(۹) ترجمان دالعلوم: سابق: ص ۲۶۔

(۱۰) آپ کوثر: محمد اکرام الدین، بعنوان: ہندوستان میں فقہ اسلامی کا آغاز ص ۱۲۶

(۱۱) ایضا ص ۱۲۶

(۱۲) ایضا ص ۱۲۷

☆☆☆

اصل کامیابی

انسان کی زندگی دو مرحلوں میں بٹی ہوئی ہے، ایک دنیاوی زندگی کا مرحلہ اور دوسرا اخروی زندگی کا، دونوں کی کامیابی ہر انسان کا منتہائے مقصود ہے، اور دونوں مرحلوں میں ناکامی سے بچنا اس کی تمناؤں کی انتہا ہے، مگر دونوں کی کامیابی ایک دوسرے سے ایک سبب ہے تو دوسرا مسبب اور نتیجہ اگر دنیا میں کامیابی پرسکون زندگی کا نام ہے تو آخرت میں رضائے الٰہی نے حصول اور دخول جنت کا، مگر دنیا میں سکون حقیقی ایمان کے بغیر میسر نہیں، اور آخرت کی خوشبختی اسی ایمان کا نتیجہ ہے۔

بحث وتحقیق

سیکولرازم: کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں؟

محمد انس فلاحی سنبھلی
(ریسرچ اسکالر) ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

انسان روز اول ہی سے کسی نہ کسی نظریہ کا حامل رہا ہے۔ چاہے وہ نظریہ ربّانی ہدایت کا رہین منت ہو یا انسان کے خود ساختہ قوانین پر مبنی ہو۔ بہر حال انسان کی فطرت میں کسی نہ کسی نظریہ کا خمیر موجود رہا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح ہے یا غلط وہ انسانیت کیلئے نفع بخش ہے یا ضرر رساں۔ گذشتہ دوصدیوں میں متعدد نظریات منصۂ شہود پر آئے۔ ڈارون کا نظریہ ارتقاء، فرائڈ کا نظریہ جنس اسی طرح سرمایہ داری ،اشتراکی نظریہ موخرالذکر دونوں معاشی نظریات ہیں۔ اور نیشنل ازم یہ سیاسی نظریہ ہے ۔ ان نظریات کے حاملین نے ان کو اپنایا اور وسیع پیمانے پر ان کی اشاعت وتبلیغ کی ، ان کے دورس اثرات انسانی سماج پر پڑے اور معتد بہ تعداد ان سے متاثر ہوئی ہے بالخصوص یوروپین ممالک۔ انہی نظریات میں سے ایک سیکولرازم ہے یعنی لادینی نظریہ جس کے ظہور میں آنے کے اسباب و علل چاہے کچھ ہوں لیکن اس نظریہ نے انسانوں کی اکثریت کو اپنے دام فریب میں لیا ہے۔

سیکولرازم معنی و مفہوم

سیکولرازم انگریزی زبان کا لفظ ہے جو دو لفظ سے مرکب ہے ایک سیکولر (Secoler) اور دوسرا ازم، اکسفوڈ ڈکشنری میں Secoler کے معنی ہیں۔

Not Connected with Spiritual or Religious Matters ''یعنی دنیاوی، غیر روحانی جس کا مذہبی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو''۔

اس کے برعکس Seculrism کی تعریف اکسفورڈ ڈکشنری مطبوعہ ۲۰۱۰ء میں کچھ اس طرح ہے۔

The belife that religion should not be involved in the organization of society and education ect. ''یہ ماننا کہ مذہب معاشرے اور تعلیم کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا''۔

شارٹر آکسفورڈ ڈکشنری میں سیکورازم میں (Secularism) کی تشریح کچھ اس انداز میں ہے۔

''یہ اصول کہ اخلاق کی بنیاد خدا اور یوم آخرت پر ایمان کے تمام تقاضوں کو خارج کرکے کلیۃً نوع انسانی کی دنیوی خوشحالی پر ہونی چاہیے''۔

سیکولرازم کا مطلب یہ ہے کہ خدا اور اس کی ہدایت

اوراس کی عبادت کے معاملے کوایک شخص کی ذاتی حیثیت تک محدود کر دیا جائے اور انفرادی زندگی کے اس چھوٹے سے دائرے کے سوادنیا کے باقی تمام معاملات کوہم خالص اپنی صواب دید کے مطابق جس طرح چاہیں طے کریں۔

سیکولرازم کا پس منظر

مغرب میں لادینی ریاست کا تخیل ایک خاص پس منظرکی پیداوار ہے وہاں پاپائی نظام نے جوشکل اختیار کرلی تھی اور مذہب کے نام پر بادشاہوں سے گٹھ جوڑ کے ذریعہ جن مظالم کوسند جواز دی گئی تھی انہوں نے ایک ردّعمل پیدا کیا۔عیسائی پادری حرص وہوا اور بددیانتی کی اندھی قوت کے بل پر اس قدر اندھے ہو چکے تھے کہ انہوں نے ان باغیوں کو سزائیں دینا شروع کر دیں جو پادریوں کے افعال واقوال پر نقطہ چینی کرتے تھے۔اور باقاعدہ مذہبی عدالتوں کا ادارہ قائم کر دیا اور برونو (Bruno) کی طرح ہزاروں آدمیوں کو زندہ جلایا گیا۔ مشہور سائنسداں (Galileo) گلیلیو کو اس بات پر پھانسی دی گئی کہ اس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے کیونکہ یہ بات صدیوں سے چرچ میں بتائے جانے والے نظریہ کے خلاف تھی۔قصہ یہ ہے کہ لوگ عیسائی پادریوں سے تنگ آ چکے تھے۔

سماج کی تشکیل نو اور آئین وشریعت میں رہنمائی کا حوصلہ عیسائیت میں ماند پڑ چکا تھا۔بادشاہ کا کام تھا کہ وہ مذہبی رہنماؤں کو ڈھیر سارے عطیات،زمین جائداد وغیرہ دیا کرتے تھے کہ خدا نے اس کو حکمراں بنانے کیلئے چنا ہے ۔اس طرح حکمراں اور چرچ دونوں نے مل کرعوام کوخوب خوب ستایاان پرطرح طرح کے مظالم ڈھائے۔لہذا یہ ضروری تھا کہ ایک وقت وہ چنگاری ایک زبردست آتش فشاں کی شکل اختیار کرے۔لہذا عوام نے حکمراں اور چرچ کے خلاف محاذ کھولنے کا فیصلہ کرلیا۔یہاں سے سیکولرازم کی ابتدا ہوئی لوگوں نے مذہب کے پورے ادارے کو لے ڈوبنے والی اس تبدیلی کوخوش آئند سمجھا۔لوگوں کی ذہنی بغاوت اور روشن خیالی نے جوکہ چرچ کی اجارہ داری کے ذریعہ دبی ہوئی تھی عام آدمیوں کو ہرقسم کی پابندیوں کے خلاف لاکھڑا کر دیا۔خواہ یہ پابندیاں مذہب کی طرف سے تھیں یا معاشرے کی طرف سے۔ پھرکسی قوت بالا کے وجود پر یقین ختم کرنے کیلئے کئی طرح کے علوم کی شاخیں پیدا ہوگئیں۔آدمی بس یہی سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ مادہ نیوٹرون پروٹون کے ملاپ کے علاوہ کچھ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اہل مغرب نے کائنات کے خالق کو دنیاوی معاملات سے بےتعلق کر دیا۔مغرب کی تاریخ میں یہ زمانہ نشاۃ ثانیہ Renaissance کہلاتا ہے۔

مذکورہ بالا سیکولرازم کا پس منظرتو وہ ہے جسے بالعموم مصنفین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے ،علاوہ ازیں سیکولرازم کے تعلق سے مسلم مفکرین نے اس سے ہٹ کر باتیں کہی ہیں جن میں ایک ڈاکٹر راشد شاز صاحب ہیں وہ اپنی کتاب ادراک زوال امت میں رقمطراز ہیں۔

”سیکولرائزیشن معزول امتوں کے لئے ایک نئے دین کی تیاری ہے ،اجتماعی اور انفرادی زندگی کی ثنویت

اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اجتماعی زندگی کے بگاڑ کو مذہبی تشریح وتعبیر نہ صرف یہ کہ گوارا کرے بلکہ اس کیلئے مذہبی جواز فراہم کرے''۔

دوسرے مسلم مفکر ڈاکٹر اسرار عالم سیکولرازم کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''سیکولرازم اور سیکولرائزیشن کا عمل دراصل یہودیوں نے کئی صدیوں سے اپنے دشمنوں کو زیر کرنے کیلئے اور ان کو مذہب سے بیزار کرنے کیلئے اور ان کی اخلاقیات کو پراگندہ کرنے کیلئے استعمال کیا ہے، یہ کسی ردعمل کے طور پر وجود میں نہیں آیا ہے۔ پہلے انہوں نے یہ کوشش عیسائی معاشرے میں کی ہے اور اب اس کو عالمگیر پیمانے پر مسلم معاشرے میں کررہے ہیں''۔

سیکولرائزیشن میں کوئی ایسا نظریہ حیات نہیں ہے جنہیں وہ انسانوں کیلئے پسند کرتے ہیں حالانکہ وہ اس سے اپنا دامن بچاتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کا معاشرہ ان برائیوں سے پاک رہے سیکولرازم خدا مخالف، اجتماعیت مخالف اور مرد وزن میں زوجیت کا مخالف نظریہ ہے''۔ (سیکولرازم اور سیکولرائزیشن ص ۲۴۔ اسرار عالم)

اسرار عالم صاحب نے آگے مسلمانوں کو سیکولر بنانے کیلئے سیکولرائزیشن کے مختلف طریقے جو استعمال کیے جارہے ہیں انہیں قلمبند کیا ہے۔

۱۔ بیوٹی پالر کلچر
۲۔ سیکس ایجوکیشن کلچر
۳۔ ایڈس کلچر
۴۔ فیشن شو کلچر
۵۔ ملبوسات کلچر
۶۔ xxx کلچر

سیکولرازم کا باقاعدہ آغاز

سیکولرازم کا آغاز ۱۸۳۲ء میں ہوا جب کہ جیکب ہولیک نے سیاست کو مذہب سے پاک رکھنے کی یہ تحریک قائم کی۔ اس تحریک کی سربراہی اہل فکر و سیاست کے ہاتھوں میں رہی اور بہت جلد اس مسلک کو سیاسی قبولیت حاصل ہوگئی۔ مختصراً اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اجتماعی اور سیاسی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہیے شروع میں بات صرف مذہب کے معاملے میں غیر جانبداری اور فرد کی کامل آزادی کی تھی۔ لیکن بعد میں اس تحریک کا ایک حصہ مذہب کی مخالفت میں جارحانہ مادیت اور اشتراکیت کا داعی بن گیا۔ افسوس صد افسوس! یورپ نے عیسائیت کی مخالفت میں اتنی بے اعتدالی کی کہ خود مذہب کے خلاف بغاوت کردی جب کہ مخالفت حکمراں اور چرچ کی کرنی تھی۔ اور اس بغاوت کے بطن سے لادینی ریاست منصۂ شہود پر آئی۔

سیکولرازم مذہب سے بغاوت

سیکولرازم اگرچہ بالعموم مذہبی اور سیاسی امور کو الگ الگ رکھنے کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے لیکن اس کی اصل تعریف کو سامنے رکھا جائے تو یہ اس کی ملمع کاری ہے۔ حقیقت میں سیکولرازم مذہب (Religion) کو سرے سے مانتا ہی نہیں کیونکہ مذہب کی بنیاد ایک مافوق الفطرت

طاقت کے وجود کو ماننا ہے جبکہ سیکولرازم کسی بھی نیچرل طاقت، چیز یا ہستی کے وجود کا انکاری ہے۔لہذا سیکورازم بظاہر تو لوگوں کے مذہبی معاملات میں یہ کہہ کر مداخلت نہیں کرتا کہ Religion is the private affair of an individual (مذہب کسی فرد کا ذاتی معاملہ ہے) لیکن نظام تعلیم کی بنیاد facts&science پر رکھ کر وہ نہ صرف مذہبی تعلیم کو نصاب سے خارج کر دیتا ہے بلکہ اپنے نظام تعلیم کے ذریعہ وہ کسی کو اس قابل ہی نہیں چھوڑتا کہ وہ اللہ کو مانتے رہیں باقی مذہبی تصورات تو وہ ہیں ہی ایمان باللہ کے تابع نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی تو کھلے الفاظ میں اللہ کا انکار کرتا ہے ”Iwas born with no religion“ اور کوئی دانشور حقارت سے مذہب پر پھبتی کستا ہے۔ Religion is the opinion of the masses واقعہ یہ ہے کہ سیکولرازم مذہب کیلئے سمّ قاتل ہے۔

سیکولر اسٹیٹ کی تعریف

سیکولر اسٹیٹ وہ ہے جہاں مذہب کو اجتماعی امور سے بے دخل کر کے پرائیویٹ معاملات تک محدود کر دیا گیا ہو اور اس مختصر سے میدان میں بھی عمل کی آزادی ان حدود کے اندر رہ کر ہو جو ریاست کے قانونی ڈھانچے نے متعین کر دی ہوں۔جن ممالک نے سیکولرازم کو اپنایا ہے۔ان میں فرانس، امریکہ، ترکی اور ہندوستان قابل ذکر ہیں سیکولر ریاست بلاشبہ مذہب کی اجازت تو دیتی ہے لیکن یہ آزادی مذہب کو محدود کر دیتی ہے۔سیکولر سیاست کا منشاء یہ ہے کہ مذہب کو عبادت تک اور زیادہ سے زیادہ ”پرسنل لاء“ تک محدود کر دیا جائے اور زندگی کے باقی تمام معاملات یعنی تعلیم، معاشی نظام قوانین اور سیاسی ڈھانچہ مذہب کی گرفت سے آزاد ہوں۔ظاہر ہے کہ اس آزادی کو فی الواقع مذہبی آزادی نہیں کہا جاسکتا ہے۔

ہندوستان اور سیکولرازم

آزادی وطن کے بعد جب ۱۹۵۰ء میں ہندوستان کا آئین مرتب ہوا۔اس وقت دستور صرف جمہوری تھا اس کے ساتھ سیکولر کا لفظ موجود نہیں تھا۔جس وقت دستور ساز اسمبلی دستور کی تشکیل میں مصروف تھی اس وقت ایک ممبر اسمبلی پروفیسر کے ٹی شاہ نے بہت کوشش کی کہ لفظ سیکولر کو اس دستور میں شامل کر لیں اس وقت تو انہیں اس سلسلے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی البتہ ۱۹۷۶ء میں چوالیسویں ترمیم کے وقت بھارت کے آئین میں یہ لفظ جوڑا گیا ہندی نقطۂ نظر کی نرمی کے پیچھے خیال یہ تھا کہ جبری طور پر کوئی مذہب کسی پر تھوپا نہ جائے اور ہر مذہب کو اپنے فطری انداز میں پھلنے پھولنے کا ہی نہیں بلکہ پھیلنے کا بھی حق ملے۔صاف اور واضح طور پر یہ حق بھارت کے آئین میں ہر مذہب کو حاصل ہے۔اس کے باوجود مذہب کے نام پر قتل و غارت گری بھی پھیلتی جا رہی ہے۔ بالخصوص ہندوستان میں مسلم اقلیت کے ساتھ ناروا سلوک برتا جا رہا ہے۔منصوبہ بند طریقے سے منظّم انداز میں مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے ملک میں کہیں بھی بم دھماکہ ہو نگاہیں مسلمانوں کی طرف اٹھتی ہیں۔مسلم نوجوانوں کو

جھوٹے اور فرضی مقدّمات میں پھنسا کر پس دیوار زنداں ڈال دیا جاتا ہے۔کیا اس کے بعد بھی ہندوستان کو سیکولر ملک کہنا دانشمندی کی علامت تصور کیا جائے گا؟؟۔

لا دینی نظریے کے تباہ کن اثرات

ا۔سیکولرازم نے تشکیک اور ذہنی پراگندی کو پیدا کیا ہے کوئی ایک نصب العین انسان کے سامنے نہیں رہا اور ایک قسم کی بے عقیدگی انسان میں پھیل گئی ہے۔یہ اسی ذہنی انتشار اور فکری پراگندی ہی کا نتیجہ ہے کہ اشتراکیت اور فسطائیت جیسی تحریکوں نے جنم لیا اور انسان کو مادہ پرستی کی انتہا کی طرف لے گئیں۔

۲۔فرد کے سامنے نیا نصب العین صرف ذاتی اغراض وخواہشات کی تکمیل رہ گیا ہے اور قومی پیمانے پر مصلحت اور موقع پرستی نے انفرادی زندگی کو ظلم سے بھر دیا اور کوئی مستقل ضابطہ اخلاق ملکی اور قومی زندگی کیلئے باقی نہ رہا۔ اس صدی نے ایسی دو ہولناک عالمی جنگوں کا مشاہدہ کیا جن میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد انسانیت کی پوری تاریخ کی تمام جنگوں کے مجموعی مقتولین ومجروحین کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

۳۔اس کے عام اخلاقی اثرات بھی تباہ کن تھے۔ مستقل مزاجی، پامردی جرات اور سب سے بڑھ کر نیکی اور بدی میں تمیز کا مادہ ختم ہونے لگا اور افادیت، مصلحت بینی اور ابن الوقتی انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی بنیاد بن گئی ۔ اس کے نتیجہ میں ہزاروں سماجی اور معاشرتی برائیاں رونما ہوئیں جو معاشرہ کو سکون واطمینان سے محروم کیے ہوئے ہیں۔

۴۔تجربہ نے بتایا ہے کہ اگر خالص مادی فائدہ پیش نظر ہو اور کوئی اعلی اخلاقی اور روحانی نظام موجود نہ ہو تو محض مادی فائدہ بھی انسان کو حاصل نہیں ہوتا ہے۔ارنلڈ ٹائن بی سیکولرازم کے نتائج کا جائزہ لے کر کھلے الفاظ میں اس کی ناکامی کا اعتراف کرتا ہے۔

’’اب واضح ہو گیا ہے کہ اگر صرف دنیاوی خوشی کو مقصد زیست بنا دیا جائے گا تو اس میں فرد کی مادی خوشحالی اور دنیاوی سکون کا حصول بھی ناممکن ہے۔ہاں یہ قابل فہم ہے کہ اگر سیکولرازم سے بلند وبالا کوئی روحانی مقصد سامنے رکھا جائے تو ایک ضمنی نتیجہ کی حیثیت سے انسان کو دنیاوی خوشی بھی حاصل ہو جائے‘‘۔

۵۔سیکولر نظام نے برصغیر کے جدید تعلیم یافتہ طبقے پر گہرے اثرات ڈالے ہیں پاکستان میں اسلامی ریاست کی طرف عملی پیش قدمی کے راستے میں وہاں کے ’’سیکولر‘‘ دانشور مسلسل رکاوٹ ڈالتے رہے ہیں۔یہ سیکولر نظام تعلیم ہی کا نتیجہ ہے۔

۶۔سیکولرازم کے وضع کردہ نظام میں پڑھ کر کوئی شخص غیب (Unseen) کی حقیقت کو ماننے کیلئے تیار ہی نہیں ہوتا ہے۔لہذا وہ مذہبی حقائق جیسے اللہ کے وجود، آخرت کے واقع ہونے کا اور وحی کی صداقت اور رسالت پر یقین نہیں رکھتا ہے۔

سیکولرازم اور اسلام

سیکولرازم اور اسلام کے درمیان موازنہ کرتے

ہوئے ڈاکٹر محمد رفعت صاحب لکھتے ہیں۔

''سیکورازم خدا اور انسان کے تعلق کی صاف نفی کرتا ہے۔سیکولرازم اس رجحان کا نام ہے اصلاً اس دنیا اور اس کے معاملات پر توجہ کی جائے چاہے زبان سے آخرت کا انکار نہ ہولیکن زندگی کے امور ومسائل پر گفتگو اور بحث میں اور کارحیات کی انجام دہی میں آخرت کو اور اس کے امکان کو نظر انداز کر دیا جائے سیکولرازم اس بات کا بھی نام ہے کہ تعلیم سیاست اور دیگر اجتماعی امور کو مذہب سے آزاد رکھا جائے۔

سیکولرازم میں اجتماعی زندگی کے معاملات کی تنظیم کیلئے انسان کی عقل کو رہنما بنایا جائے گا۔سیکورازم آخرت کا کوئی تصور نہیں رکھتا چنانچہ وہ صرف دنیا کے معاملات سے بحث کرتا ہے۔اس کے برعکس اسلام کا پیغام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔اسلام دنیا اور اس کے معاملات کی انجام دہی کیلئے بندے سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ خدائی ہدایات کی پیروی کرے۔اسلامی نظریہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمہ گیر اور جامع ہے وہ انسانی زندگی کے جملہ شعبہ جات سے بحث کرتا ہے۔سیکولرازم کے پاس انسان کی اصلاح وتربیت کیلئے کوئی پروگرام نہیں ہے۔جبکہ اسلام کے پاس انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں کے تعلق سے مکمل نظام تربیت موجود ہے''۔

اسلام اور سیکولرازم کے درمیان فرق کرتے ہوئے مولانا سیّد حامد علی لکھتے ہیں۔

''اسلام دین ہے جو پوری زندگی کو پرائیوٹ ہو یا پبلک، افراد سے متعلق ہو یا اجتماع یا ریاست سے اللہ کی مرضی کے تابع کرنا چاہتا ہے۔جس میں حقیقی قانون ساز صرف خدا ہے اور جس میں ریاست کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہے۔اسلام اور سیکولرازم دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں جہاں اسلامی نظام غالب ہوگا وہاں سیکولرازم نیست ونابود ہو جائیگا۔اور جہاں سیکولرازم ہوگا وہاں اجتماعی امور میں اسلام نہ ہوگا اور انفرادی زندگی کے محدود دائرے میں بھی اس کی حیثیت مغلوب ومقہور کی ہوگی''۔

خلاصہ بحث

۱۔سیکولرازم ایک غیر اسلامی نظریہ ہے جو انسانی سماج بالخصوص مسلم معاشرے کیلئے افیون کے ہم معنی ہیں۔

۲۔سیکورازم میں انسانی زندگی سے متعلق کوئی واضح اور متعین اصول نہیں ہے۔

۳۔سیکولرازم مذہب سے بغاوت کا نام ہے۔

۴۔سیکولرازم میں ریاستی نظام اور معاشرتی نظام کو چلانے کے لئے عقل پر انحصار کیا جاتا ہے جو کسی بھی صورت میں صحیح نہیں ہے چونکہ انسانی عقل محدود ہوتی ہے۔

فتنہ سیکولرازم اور ہماری ذمہ داریاں

سیکولرازم کا فتنہ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کو سیکولرائز کرنے کی منظّم انداز میں کوششیں کی جارہی ہیں جس سے جدید تعلیم

یافتہ طبقہ خاصہ متاثر اور مرعوب ہو رہا ہے۔

اگر اس فتنہ پر بند نا باندھا گیا تو یہ فتنہ رفتہ رفتہ ہمارے سماج میں مستقل جگہ بنالے گا۔اوراس وقت ہماری کوششیں اس سلسلے میں سودمند ثابت نہ ہوں گی۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس سلسلے میں سعی پیہم اور جہد مسلسل کریں تاکہ یہ فتنہ جو ہمارے معاشرے میں جوکسی قدر اپنی جگہ بنا چکا ہے ۔ راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوجائے۔اس سلسلے میں چند چیزوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۱۔ دین کا صحیح تصور لوگوں میں پیدا کیا جائے کہ دین مکمل نظام زندگی کا نام ہے۔ دین یہ نہیں ہے کہ پرائیوٹ سیکٹر میں خدا کی عبادت کی جائے اوراس سے باہر اپنی من مانی کی جائے۔

۲۔ فتنہ سیکولرازم کے خدوخال کو لوگوں کے سامنے دلائل وبراہین کے ساتھ پیش کیا جائے۔

۳۔ سیکولر نظریے کی خرابیوں کو لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے تاکہ وہ اس سے اپنا دامن بچانے میں عافیت محسوس کریں۔

۴۔ الحاد پسند افراد کے سامنے مذہب کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے اورانہیں اس بات کا احساس دلایا جائے کہ مذہب انسانی زندگی کے لئے جزء لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے اس سے راہ فرار اختیار نہیں کیا جاسکتی۔

لیکن اس کے لئے حکمت عملی ، دانشمندی ، خاموش محنت ، ہمہ جہتی فکر، اور منظّم کوشش درکار ہوگی ۔ ورنہ بہ قول اقبال ؒ اس کے ہم مصداق ثابت ہونگے۔

توہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کرگیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

حوا له جات

۱۔Oxford Advanced Learner,s
۲۔اسلامی نظام اور مغربی لادینی جمہوریت (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)
۳۔اسلامی ریاست (مولانا سید ابولاعلیٰ مودودیؒ)
۴۔جامع اردو انسائیکلو پیڈیا (جلدسوم)
۵۔فتنہ سیکولرازم و سیکورائزیشن (ڈاکٹر اسرار عالم ،مولانا سید حامد علیؒ)
۶۔ادراک زوال امت حصہ اول (ڈاکٹر راشد شاز)

☆☆☆

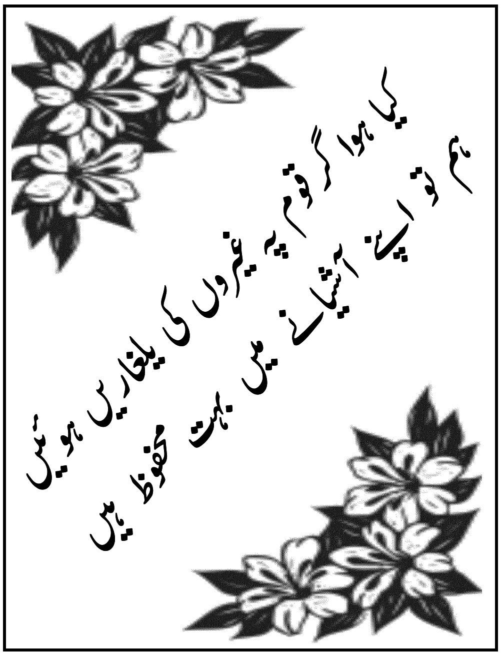

اسوۂ صحابہ

صحابہ کرامؓ کے ایمان افروز واقعات

مفتی تنظیم عالم قاسمی
استاذ حدیث دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے تمام افعال وکردار دل ودماغ میں پائے جانے والے عقائد اور جذبات وخیالات کے تابع ہوتے ہیں، دل میں ایک اللہ کا یقین اور آخرت کا خوف جب پایا جاتا ہے تو نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور دیگر عبادتوں کی انجام دہی کے لیے انسان پریشان رہتا ہے، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت اس کا مشن اور مقصد ہوتا ہے، خوشی ہو یا غم تنگی ہو یا فراخی، حالات جیسے بھی ہوں ایک مسلمان کو قرآن مجید کا عطا کردہ نظام حیات کو اختیار کرنے میں مسرت اور خوشی کا احساس ہوتا ہے لیکن یہی دل جب ایمان سے خالی ہو، یا مضبوط ایمان نہ پایا جائے تو ہزار جرائم کرتے ہوئے بھی اسے کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی، اسے اللہ کے حقوق ضائع کرنے پر افسوس ہوتا ہے اور نہ شیطانی راہ اختیار کرنے پر کوئی غم، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: أ لا وان فی الجسد مضغة اذاصلحت صلح الجسد كله واذافسدت فسد الجسد كله الاوهی القلب (صحیح بخاری کتاب الایمان) ”انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، ہاں وہ ٹکڑا دل ہے“۔ حدیث میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، اس لیے ایک مسلمان اور توحید پرست کو چاہئے کہ دل کی حفاظت کرے کہ کہیں دل میں مضبوط ایمان کے بجائے نفاق وشرک جگہ نہ بنالے، اگر کسی مومن نے دل میں پائے جانے والے ایمان وعقائد کی حفاظت نہیں کی تو نہ معلوم ایمان کب رخصت ہو جائے اور وہ اس کا احساس بھی نہ کرسکے۔

حضرت حنظلہؓ سچے اور مخلص صحابی تھے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے اٹھنے کے بعد جب انہیں محسوس ہوا کہ مجلس نبوی میں ایمان ویقین کی جو کیفیت تھی، وہ اب باقی نہیں رہی، تو انہیں نفاق کا اندیشہ ہوا، گھبراتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا حال بیان کیا، آپؐ نے ان کو تسلی دی اور نفاق سے براءت کی خوشخبری سنائی جس سے ان کو اطمینان ہوا۔ یہ حضرت حنظلہؓ کی ایمانی فکر اور اپنے ایمان کی حفاظت کی بات تھی، جب گھر میں جاکر بیوی بچے میں مشغول ہونے کے سبب ایمان کی تازگی اور مجلس نبوی کی کیفیت میں کچھ کمی نظر آئی جو ایک فطری بات ہے، تو ان کو فوری طور پر اس کا احساس ہوا اور دربار نبوی میں فوری طور پر حاضر ہوئے، کاش! آج بھی لوگوں میں یہی مزاج پیدا ہو جائے یعنی ایمان کی حفاظت، اپنے دل کی نگرانی، اپنے عمل کا محا

سبہ کہ کوئی ایسا عمل تو انجام نہیں پا گیا جس کے سبب ایمان جاتا رہا ہو یا ایمان میں کوئی فرق آ گیا ہو' اگر ایسا ہو گیا ہو تو اللہ کے حضور میں توبہ کر کے آئندہ نہ کرنے کا عزم کرنا چاہئے ۔ رفتہ رفتہ اس سے ایمان میں قوت پیدا ہو گی اور ایک وقت آئے گا کہ ہزار مخالفتوں اور مسائل کے باوجود آپ کی قلبی کیفیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور استقامت فی الدین میں ہی آپ کو مزہ اور لطف آئے گا ۔ضعیف الایمان انسان مصائب کے تصور سے بھی کانپ اٹھتا ہے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسلام کے لیے ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کیں اور ان کے ایمان میں ذرہ برابر بھی تزلزل نہیں آیا۔

حضرت بلالؓ کا نام کفار مکہ کے ہاتھوں تکلیف اٹھانے والوں میں سرفہرست ہے، آپ حبشی النسل اور امیہ بن خلف کے غلام تھے، ٹھیک دوپہر کے وقت جب کہ دھوپ تیز ہو جاتی اور پتھر آگ کی طرح تپنے لگتے تو غلاموں کو حکم دیتا کہ بلال کو تپتے ہوئے پتھروں پر لٹا کر سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا جائے تاکہ جنبش نہ کر سکیں اور پھر کہتا تو اسی طرح مر جائے گا، اگر تجھے نجات چاہئے تو ایمان سے پھر جا، لات وعزی کی پرستش کر لیکن ایمان ویقین کے پیکر حضرت بلالؓ ان تکلیفوں کے باوجود احد احد کہتے رہتے کہ معبود تو ایک ہی ہے، ایمان لانے کے بعد ایمان پر استقامت بہت اہم چیز ہے کہ ہوائے مخالفت ایمان کی شمع کو بجھا نہ سکے، سیدنا حضرت بلال جن کی پشت پر مشرکین کے جور وستم نے نشان اور داغ ڈال دیئے تھے، وہ آخری دم تک ایمان سے باز نہیں آئے اور بے سروسامانی کے عالم میں بھی کفر کی مخالفت کرتے رہے، اس میں تمام مسلمانوں کے لیے قوت ایمانی پیدا کرنے کا بڑا درس ہے۔

شروع زمانہ اسلام میں تمام مسلمانوں کو سخت اذیتیں دی جاتیں لیکن جو غلام، کمزور بے بس یا بے سہارا ہوتے ان کو زیادہ تختۂ مشق بناتے کہ ان کا کوئی مکہ میں حامی نہیں جن سے بدلہ لینے کا خوف ہو، اسلام کے مقدس گھرانوں میں حضرت یاسرؓ کا گھر شمار ہوتا ہے، یہ قحطانی الاصل ہیں جو اپنے بھائی کی تلاش میں مکہ آئے اور یہیں رہ گئے ، ابوحذیفہ مخزومی سے حلیفانہ تعلقات پیدا ہوئے تو ابوحذیفہ نے اپنی کنیز سمیہ سے ان کی شادی کرادی، ان کے بطن سے حضرت عمار پیدا ہوئے، ابتدائے اسلام میں ہی یہ لوگ اسلام میں داخل ہو گئے تھے، مکہ میں چوں کہ ان کا کوئی خاندان نہیں تھا اس لیے مشرکین انہیں بہت ہی ستاتے اور تکلیفیں دیتے عمار بن یاسر کو عین دوپہر کے وقت تپتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ بیہوش ہو جاتے کبھی پانی میں غوطے دیتے اور کبھی انگاروں پر لٹاتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمار کے سر پر دست مبارک پھیرتے ہوئے فرماتے ''اے آگ! تو عمار کے حق میں بردوسلام بن جا جس طرح ابراہیم علیہ السلام کے لیے ٹھنڈی ہوئی تھی'' چوں کہ سزا دینے والے سزا دیتے دیتے تھک جاتے مگر ان کے دل سے اللہ اور اس کے رسول کی محبت ختم نہیں کر سکے اسی لیے آپ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ عمار سر سے پیر تک ایمان سے بھرا ہوا ہے (ترمذی)

حضرت عمار بن یاسر اور ان کے والدین کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے اے آل یاسر! صبر کرو، کبھی فرماتے اے اللہ تو آل یاسر کی مغفرت فرما اور کبھی یہ فرماتے کہ تم کو بشارت ہو کہ جنت تمہاری مشتاق ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ملعون ابوجہل نے حضرت سمیہ کی شرمگاہ میں

نیزہ مارا جس سے وہ شہید ہوگئیں اور والد حضرت یاسر بھی ان ہی تکلیفوں میں انتقال فرما گئے۔ حضرت مجاہد سے منقول ہے کہ اسلام میں شہادت کا مرتبہ سب سے پہلے حضرت عمار کی والدہ حضرت سمیہ کو ملا جن کی شرمگاہ میں ابوجہل نے نیزہ مارا تھا۔(البدایہ:۳:۵۹)

کمزور مسلمانوں پر اتنے شدائد اور مصیبتوں کے باوجود ان کے ایمان میں ذرا بھی فرق نہیں آتا، کفر کی حکومت تھی، ہر طرف مشرکین اور قریش بستے تھے اس کے باوجود ایمان ویقین پر قائم رہے کہ جان کی قربانی پیش کردی مگر ایمان سے نہ ہٹے، کیا آج بھی ان کی کوئی مثال مل سکتی ہے، بلاشبہ حضرت صہیب ابن سنان، حضرت خباب بن ارت، حضرت ابوفکیہ جہنی حضرت زنیرہ اور اس طرح کے دیگر صحابہ کرام کا طریقہ ہمارے لیے آج بھی مشعل راہ ہے کہ یہ لوگ وہ تکلیفیں جن کے تصور سے چودہ سو سال کے بعد بھی آج بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، برداشت کرتے رہے مگر ایمان میں کمی تو کیا ہر مصیبت کے بعد ایمان میں قوت پیدا ہوجاتی تھی۔

ہجرت کا جب مسلمانوں کو حکم دیا گیا تو مکہ میں ان مسلمانوں کا جو گھر بار تھا، دولت اور ثروت تھی وہ سب اللہ کے لیے چھوڑ دینا پڑا، ایک تو اس لیے کہ بوجھ کے ساتھ ہجرت مشکل تھی اور دوسرے قریش کی مخالفت اور خوف کے سبب، لیکن اس کے باجود تمام صحابہ نے ہجرت کی اور اپنے تمام مال و متاع کو خیر باد کہہ دیا، بلاشبہ اس میں ان کی بے مثال قوت ایمانی کارفرما تھی، اس لیے کہ انسان دوسروں کے مال و دولت سے بے نیاز ہوسکتا ہے لیکن خود اپنے ذاتی مال و جائیداد کو نہیں چھوڑ سکتا کہ انسان کو اپنے خون پسینے سے کمائی ہوئی دولت سے بڑی محبت اور پیار رہتا ہے مگر قربان جایئے صحابہ کرام کے ایمان ویقین پر کہ اسلام کے سبب زندگی کا سارا متاع ترک کر دیا، اور ان میں سے کسی چیز کی محبت ان کو اسلام سے برگشتہ نہ کر سکی۔ حضرت صہیب رومیؓ فرماتے ہیں کہ جب ''میں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو مجھ سے قریش نے کہا کہ جب تم روم سے ہمارے پاس آئے تھے تو تمہارے پاس کچھ بھی نہیں تھا اور اب تم اتنا مال لے کر مکہ سے جارہے ہو، اللہ کی قسم! یہ کبھی نہیں ہوسکے گا، تو میں نے ان سے کہا اچھا یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں اپنا مال دے دوں تو پھر کیا مجھے چھوڑ دو گے؟ انہوں نے کہا ہاں چنانچہ میں نے اپنا مال ان کو دے دیا، انہوں نے مجھے چھوڑ دیا، میں وہاں سے چل کر مدینہ پہنچ گیا، میں نے سارا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنایا تو آپؐ نے دو مرتبہ فرمایا: صہیب بہت نفع میں رہا، صہیب بہت نفع میں رہا (تفسیر ابن کثیر:۱، ۲۴۷)۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت صہیب کی مشرکین قریش کی ایک جماعت نے تعاقب کیا، جب قریش قریب پہنچے تو حضرت صہیب نے سواری سے اتر کر اپنا ترکش سنبھالا اور کہا کہ خدا کی قسم! تیر ختم ہونے تک تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے اور تیر ختم ہونے کے بعد تلوار سے حملہ کرتا رہوں گا اس لیے اگر تمہیں مال پسند اور مطلوب ہے تو تم کو پتہ بتادوں وہ تم لے لو اور میرا راستہ چھوڑ دو، قریش مکہ اس پر راضی ہوگئے، انہوں نے مکہ میں اپنے مال کا پتہ بتادیا اور یہ مدینہ کی طرف چل پڑے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ (البقرہ،۲۰۷)'' اورانسانوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا

ہے جو اپنی جان تک اللہ کی رضا جوئی میں بیچ ڈالتا ہے''۔

صحابۂ کرام کے ان واقعات میں بلا شبہ عقلمندوں کے لیے بڑی عبرت ہے، ان کی نظر میں آخرت، اللہ کی رضا مندی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اہم چیز تھی اس لیے جان و مال قربان کرنا ان کے لیے آسان تھا ساری جائیداد اور مال و متاع قربان کر کے بھی اگر ایمان اپنے حال میں باقی رہتا تو وہ سمجھتے کہ دنیا و آخرت کی تمام دولت میرے پاس موجود ہے، اسی لیے اللہ تعالی نے دیگر مسلمانوں کو صحابہ کرام جیسا ایمان پیدا کرنے کی تاکید فرمائی، ارشاد ہے آمنو اکما آمن الناس (سورہ بقرہ:۱۳)''ایمان لاؤ جیسا کہ لوگوں نے ایمان لایا''۔ مشہور مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''ناس سے مراد و باتفاق مفسرین صحابہ کرام ہیں، کیوں کہ وہی حضرات ہیں جو نزول قرآن کے وقت ایمان لائے تھے کہ اللہ تعالی کے نزدیک صرف وہی ایمان معتبر ہے جو صحابہ کرام کے ایمان کی طرح ہو، جن چیزوں میں جس کیفیت کے ساتھ ان کا ایمان ہے اسی طرح کا ایمان دوسروں کا ہوگا تو ایمان کہا جائے گا ورنہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا ایمان ایک کسوٹی ہے جس پر باقی ساری امت کے ایمان کو پر کھا جائے گا جو اس کسوٹی پر صحیح نہ ہو اس کو شرعا ایمان اور ایسا کرنے والے کو مومن نہ کہا جائے گا''(معارف القرآن:۱،۱۲۵)

کتنے خوش نصیب تھے وہ لوگ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور صحبت کے لیے اللہ تعالی نے منتخب کیا تھا، ان کا ایمان مضبوط اور قوی تھا، حالت امن اور حالت جنگ دونوں حال میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ان کا نصب العین تھا، شریعت کے حدود سے وہ کبھی نکلتے نہیں تھے، حضرت علیؓ صحابہ کرام کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میں نے اصحاب محمد کو دیکھا ہے، مجھے تم میں سے کسی میں ان کی شباہت نظر نہیں آتی، وہ صبح کو پراگندہ بال اور غبار آلود نظر آتے جب کہ پوری رات سجدہ و قیام میں گزار چکے ہوتے، کبھی پیشانی اور کبھی رخسار زمین پر رکھتے، آخرت کی یاد کی وجہ سے انگاروں پر لوٹتے، اس قدر لمبا سجدہ کرتے تھے کہ ان کی آنکھوں کے درمیان بکری کی کھال کی طرح سفید پڑ گئے تھے، وہ اللہ کو یاد کر کے، پھوٹ پھوٹ کر روتے حتی کہ ان کے گریبان تر بہ تر ہو جاتے، عذاب کے خوف اور ثواب کی امید میں وہ اس طرح لرزتے تھے جیسے تیز آندھی میں درخت لرزتے ہیں۔''(صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی نظر میں:۱۱۸)

حضرت علیؓ نے صحابہ کرام کی جس ایمانی کیفیت کا اظہار کیا ہے یہ صرف ان صحابہ کا حال نہیں تھا جن کو اپنے انجام کی خبر نہیں تھی بلکہ ایسے صحابہ کرام جن کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف طور سے جنت کی بشارت دی تھی وہ بھی خوف خدا اور ذکر الٰہی میں ہمہ وقت مشغول رہتے، جن کے ایمان و یقین پر خود صحابہ کو بھی رشک آتا وہ بھی اللہ کے خوف سے رویا کرتے اور نیکی کی طرف سبقت کیا کرتے تھے جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ جن کو مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے کا شرف حاصل ہے اور غار ثور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ خدمت کی کہ حضرت عمرؓ کو اس رات پر رشک آتا تھا، غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی، وہ ایسا زمانہ تھا کہ اتفاق سے حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بہت مال و دولت تھی، انہوں

نے سوچا کہ آج میں مال خرچ کرنے میں ابوبکر سے بازی لے جاؤں گا، حضرت عمر نے اپنے گھر کا نصف مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو، جواب دیا، جتنا لایا ہوں اتنا ہی گھر والوں کے لیے چھوڑ آیا ہوں، اس کے بعد حضرت ابوبکر آئے اور ان کے پاس جو کچھ تھا سب لا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے، حضرت ابوبکر نے جواب دیا، ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں، حضرت عمر نے اپنے دل میں کہا کہ ابوبکر پر میں کبھی بھی سبقت نہیں لے جا سکوں گا۔(ترمذی ،ابوداؤد)۔

حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے جواب کے ذریعے اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا و خوشنودی ہی میرے اور میرے اہل وعیال کے لیے دونوں جہاں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اس سرمایہ کے مقابلے میں دنیوی مال واسباب کی بڑی سے بڑی پونجی بھی بے وقعت ہے، مسلمانوں کے دلوں میں اگر یہ ایمان پیدا ہو جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اللہ کی رحمت ہماری طرف متوجہ نہ ہو اور ہماری زندگی کے مسائل حل نہ ہوں، ایمان کی کمزوری ہے کہ عالم اسلام مختلف حوادث سے دوچار ہے، اسلام آج بھی زندہ ہے اور قیامت تک اس میں ثبات رہے گا، ضرورت ہے کہ مسلمان اسلامی اصول اور قرآنی ضابطۂ حیات کو اختیار کریں تاکہ ان کی عظمت رفتہ بحال ہو جائے اور اللہ کی مدد حاصل ہو۔

حضرت ابوبکرؓ کی ایمانی قوت اور ایمانی غیرت کا اس واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب کہ آپ کے خلافت سنبھالنے کے بعد بعض عرب قبائل مرتد ہو گئے تھے، ان لوگوں نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا تھا، حضرت ابوبکر نے ان سے جہاد کا اعلان کر دیا، جب کہ یہ ابتدائے خلافت کا زمانہ تھا، حضرت عمر فاروق جیسے بہادر صحابی کا بھی رویہ نرم تھا کہ ابھی مانعین زکوۃ سے جہاد مناسب نہیں، حضرت ابوبکر نے حضرت عمر سے فرمایا: کیا تم اپنے زمانہ جاہلیت میں ہی غیور و بہادر قوی وغصہ ور تھے اور اب زمانہ اسلام میں بزدل وپست ہمت ہو گئے، اس حقیقت کو نہ بھولو کہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے اور دین کامل ہو چکا ہے ایسی صورت میں دین کمزور اور ناقص ہو جائے ایسا میں اپنی زندگی میں کبھی نہیں ہونے دوں گا (مشکوۃ ۵۵۶)۔ایک مسلمان کے لیے حضرت ابوبکر کا یہ جواب اپنے اندر بڑا درس رکھتا ہے، قادیانیت عیسائیت یا کسی بھی اعتبار سے کہیں اسلام کا چراغ بجھانے کی کوشش کی جائے توحید پرستوں کو اس کے سبب بے چین ہو جانا چاہئے کہ یہی ایمان کا تقاضا ہے، آج کوئی خلیفۃ المسلمین مسلمانوں کے درمیان موجود نہیں جو اسلام پر ہونے والے حملوں کا منہ توڑ جواب دے، اس زمانے میں تمام مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے کہ اسلام کے خلاف اٹھنی والی آوازوں کو دبائیں اور اسلام کی جانب سے ہر ممکن دفاع کریں، اس کے لیے شرط ہے کہ خود پہلے اپنے دلوں میں ایمانی قوت پیدا کی جائے اور سینکڑوں مصائب کے باوجود ایمان ویقین میں کوئی تذبذب واقع نہ ہو جیسا کہ صحابہ کرام نے مخالفت اور مشکلات کے طوفان میں بھی کفر سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

☆☆☆☆☆

تذکرہ

آہ! مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

شعیب احسن اعظمی ندوی
مدرسہ فلاح المسلمین امین نگر تیندوا

صاف رنگ، واضح نقوش، مسکراتا دہانہ، فکرمند آنکھیں، چوڑی پیشانی، گھنی قدرے سیاہ اور بیشتر سفید داڑھی، کتری ہوئی مونچھیں مگرنوک مسترسل، یہ چہرہ ہے استادگرامی مولانا عبداللہ محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ کا۔

مولانا کی ولادت ۲۹ر جنوری ۱۹۵۷ء کو ایک ایسے معزز گھرانے میں ہوئی جسے سلالۃ السادات ہونے کا شرف حاصل ہے، اس خاندان کا پورا ہندوستان منت کش احسان ہے، اس سلسلۂ خاندان میں ہندوستان کے اندر ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیسی کیسی ہستیاں پیدا کیں، بیان کرنے اور یادرکھنے کی ہیں، لیکن یہ اس کا موقع نہیں، شاہ علم اللہؒ سید احمد شہیدؒ، مولانا عبدالحئیؒ ہر ایک اپنی جگہ میں منارۂ بلند اور مہر درخشاں اور ابھی ماضی قریب کی شخصیت، عرب وعجم کا متفق امام، مفکر، ناقد، ادیب، مصلح اور داعی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جو اپنے آپ میں ایک انجمن اور جامع کمالات تھے ان کو کون بھول سکتا ہے، ان کے احسان سے امت مسلمہ ہندیہ کا کون شخص گراں بار نہیں؟۔

مولانا عبداللہ حسنیؒ اسی سنہری لڑی کے آبدار موتی تھے، بنیادی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، وہاں کی نورانی اور ایمانی فضاؤں نے ہی آپ کی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تربیت کی ''تحنیک'' کی، مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی تربیت کا رنگ آپ پر بڑا گہرا تھا، آپ نے مولانا مرحوم کے روز وشب کا بڑی وضاحت سے مطالعہ کیا تھا، ان کی نگاہِ تربیت خصوصیت سے آپ پر پڑی تھی، جس نے آپ کے اندر چار چاند لگا دئے تھے، عالمیت وفضیلت کی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پوری کی، اور اپنے وقت کے ممتاز وجلیل القدر اساتذہ وعلماء سے کسب فیض کیا، آپ کے والد مرحوم مولانا محمد الحسنی کو قدرت نے زبان وبیان اور ادب عربی کا وہبی علم مرحمت فرمایا تھا، آپ کو بھی قدرت نے علم کا حصۂ وافر عنایت فرمایا، قلم میں اثر اور زبان میں وہ جادو تھا کہ ہر دل گرویدہ اور ہر نفس آپ کا شیدا، آپ کی صلاحیتوں اور میزان علم میں آپ کے وزن کو دیکھ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء نے آپ کو استاد مقرر کیا پھر اس شمع سے اتنے چراغ مستنیر ہوئے جن کی تعداد ہزاروں کو پہونچتی ہے۔

مرحوم کا انداز بیان انتہائی شگفتہ اور طریقہ تعلیم

بڑا نرالہ تھا، طلبہ آپ سے بہت مانوس رہتے، ہر ایک پر شفقت، ہر کسی سے محبت آپ کا شیوہ، دردمندی وخلوص آپ کا وطیرہ اور سادگی و خاکبازی آپ کا طرۂ امتیاز تھا، مسائل سلجھانا اور بیکار باتوں کو خاطر میں نہ لانا آپ کی عادت تھی اور اسی کی تعلیم بھی دیتے، نہایت بے ضرر آدمی تھے، مولانا کسی کی کوئی پریشانی یا تکلیف پر مطلع ہوتے تو فکر مند ہوجاتے اور حتی المقدور اس کے حل کی تدبیر فرماتے، اپنے احباب اور مولاناؒ سے تعلق ونسبت رکھنے والے کتنے ہی طلبہ کو نام بنام ہم جانتے ہیں جو مولانا کی فکروں کا حصہ اوران کے خلوص ومحبت کی صہبا کے جرعہ کش ہیں میرے ذہن میں وہ تصویریں اور شکلیں رقصاں ہیں جن کی باتوں کے بیچ مرحوم کا حوالہ اوران کی مہربانیوں اورتوجہات کا ذکر لازم تھا، ایک بار کا ذکر ہے فراغت کے بعد مجھے فکر تھی کہ کسی مناسب جگہ پر تعلیم وتعلم کا شغل مل جاتا، اس مقصد کے لئے رمضان میں اپنے محسن ومربی مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی مہتمم دارلعلوم کی سفارش کے ساتھ درخواست لے کر تکیہ کلاں رائے بریلی پہونچا، وہاں پر استاد مرحوم موجود تھے محرومی قسمت سے کبھی کسی سے ملاقات کا معمول نہیں رہا، لیکن میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوکر سفارش کا طالب ہوا، آپ نے بغیر کسی تأمل کے فوراً سفارش فرمادی، مولانا مرحوم کو میرے والدگرامی شیخ الحدیث مولانا ضیاء الحسن صاحب اعظمی مرحوم سے تلمذ تھا، اس وجہ سے بخوبی پہچانتے بھی تھے۔

مرحوم کو اپنے تلامذہ سے ابویت کا خلوص تھا، آپ سے ملنے والے طلبہ بھی بنوت کی لذت سے سرشار رہتے تھے، مولانا کی دھن تعمیر تھی، افرادکار کی فراہمی و تیاری تھی، وہ بے کار ولغو اور لہولعب کی زندگی گزارنے والوں پر افسوس کرتے تھے، اگر کسی طالب علم کے اندر زبان وبیان کی ناخوشگواری یا فرض عبادات سے بے توجہی سنتے تو یوں متعجب ہوتے جیسے کوئی ''ان ہونی'' پیش آجائے، صاف دل گرفتگی وناپسندیدگی کا اظہار فرماتے، کیا کیا بیان کیجئے، ....قدر تو کھونے کے بعد ہی ہوتی ہے۔

مرحوم استاد گرامی بے لوث خادم تھے، بالکل بے لوث، نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا، اچھی طرح یاد ہے کہ ایک جلسہ میں ناظم جلسہ نے مولانا کو دعوت خطاب دیتے ہوئے آپ کا تعارف کرایا اور اپنی عقیدت کے اظہار میں مولانا کی عظمت میں چار چھ جملے بول دئے، مولانا کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوگئے ار جب گویا ہوئے تو الفاظ نے ظاہر وباطن کی تصدیق کردی، آپ نے فرمایا! کسی کے تعارف میں مبالغہ یا اس کی اتنی تعریف موزوں نہیں جس سے اس کو شرمندگی ہونے لگے، انہوں نے میرے تعارف میں بہت مبالغہ کردیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اندر احتساب نفس کا جذبہ تھا اور لازماً یہی وہ خوبی تھی جس نے آپ کو بہت جلد اس منزل تک پہونچادیا، سالک کو جہاں پہونچنے میں اک عمر درکار ہوتی ہے دوران طالب علمی درجہ کے اندر مولانا کی بعض گفتگو اور بعض بزرگوں کے حالات اور ان کے

احتساب نفس وغیرہ کا تذکرہ اس انداز سے فرماتے تھے جس سے آپ کے شوقِ عمل کا پتہ چلتا تھا، اس سلسلہ میں بعض واقعات کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے لئے یہ محل موزوں نہیں۔

حلم و برد باری انسان کی عظمت کا زیور ہے، ہمارے درجہ کے ایک ساتھی نے دوران درس مرحوم جیسے سنجیدہ استاد سے ایسا سوال کر دیا کہ ہم حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، لیکن مولانا نے بہت مختصر لفظوں میں اسے جواب دے کر درس آگے بڑھادیا، بعد میں سارے ہی ساتھیوں نے اسے تنبیہ کی۔

کوئی ۱۶ر۱۷رسال پہلے کی بات ہوگی، استاد کسی سفر سے واپس آرہے تھے ریل گاڑی کو میرے وطن ''مئو اسٹیشن'' سے گزرنا تھا، مولانا کو کوئی کام تھا، چاہتے تھے کہ کوئی اسٹیشن آجاتا میں کافی کم عمر تھا، کسی نے ندوی برادران کو اس کی اطلاع بھی دی، لیکن کوئی اسٹیشن نہیں پہونچا، یہ بات بڑی بداخلاقی اور احسان ناشناسی کی تھی، لیکن میں نے اس کا کوئی تأثر نہ خود آپ کی کسی ملاقات میں محسوس کیا، نہ ''مئو'' کے کسی ملنے والے کو اس بابت کبھی کچھ کہتے سنا۔

مقدور ہوتا خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

مولانا مرحوم کے درس کے دوران کبھی کبھی ان کی دینی و ایمانی حمیت اور مغرب کے دجالی فتنہ سے عداوت ونفرت محسوس کرنے کو ملتی تھی، مولانا ان کی فتنہ سامانیوں کی دھجیاں بکھیر دیتے تھے، اور ہر آن اس کے سیلابی فتنے سے ہوشیار کرتے رہتے تھے، عقیدہ وایمان کی نسبت ایسی واضح گفتگو فرماتے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیتے، افراط وتفریط سے پاک متوازن طبیعت کے مالک تھے، مولانا ایک انسان تھے، اچھے اور نیک طبیعت انسان تھے، کبھی غصہ بھی ہوتے، ہلکی پھلکی ڈانٹ بھی پلا دیتے، لیکن عموماً یہ دینی یا تعلیمی امر سے متعلق ہوتا تھا، کسی کی نسبت ایک دو جملے سے زیادہ بولتے آپ کو نہیں سنا، نرم مزاجی، انسان دوستی اور ملنساری آپ کی فطرت تھی، علم اور اس سے شیفتگی آپ نے وراثت میں پائی تھی، مولانا علی میاںؒ کے ''قرآنی افادات'' کی جمع وترتیب کا کام آپ کی نگرانی میں انجام پایا، آپ کے قلم سے بعض عربی کتابوں کے تراجم شائع ہوئے، عربی جریدہ ''الرائد'' میں تسلسل سے آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے، اور آپ اس کے ایڈیٹر بھی رہے، ان سب کے ساتھ آپ کی خصوصی دلچسپی بلکہ یوں کہیے کہ آپ کا نمایاں وصف اور مخصوص امتیاز دعوت الی اللہ تھا، آپ مولانا علی میاںؒ کے خلیفہ تھے، بیعت واصلاح کا کام پوری تندہی اور دلچسپی سے ساری زندگی کرتے رہے، کلمۂ توحید کی اشاعت کے کام کو جس طرح آپ نے اپنا مشن اور اوڑھنا بچھونا بنایا اس کی شان ہی اور ہے، بغیر کسی بینر، پوسٹر اور شور شرابے کے، خاموشی سے برادران وطن میں کام کرنا، ان تک خدا کا سچا دین اور اس کا پیغام پہونچانا، کسی کے اندر قبول اسلام کا اثر پاکر یوں چوکنا ہوجانا جیسے شکار سامنے آگیا ہو۔ ۲۰۰۳ء کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک نوجوان نے ہمارے ایک دوست سے قبول

اسلام کی خواہش ظاہر کی، کیونکہ وہ ایک مسلمان لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا، لڑکی نے کہا بغیر اسلام کے ہمارے درمیان یہ رشتہ قائم نہیں ہوسکتا، ہمارے وہ دوست اسی سال ندوہ پڑھنے آئے تھے، انہوں نے مولانا سے پہلے کبھی ملاقات نہیں کی تھی، مجھ سے کہا کہ چلو مولانا سے ملاقات کرادو اس معاملہ میں بات کرنی ہے، ہم نے مغرب کی نماز امین آباد میں ماموں بھانجے کی قبر کے پاس کی مسجد میں ادا کی، مولانا مسجد میں تشریف رکھتے تھے، لیکن نماز کے بعد چونکہ ہم مجمع میں پیچھے تھے، مولانا خاتون منزل چلے گئے، اطلاع پر مولانا باہر تشریف لائے، سلام دعا کے بعد میں نے عرض کیا کہ ہمارے یہ دوست کہتے ہیں کہ ایک لڑکا اسلام قبول کرنا چاہتا ہے، مولانا ہم سے بات کرتے ہوئے خاتون منزل کے صدر دروازہ تک آگئے، دراصل مغرب کے بعد مولانا کا شاید کوئی خاص شغل تھا، لیکن اتنی سی سنتے ہی بے چین ہوگئے فرمایا: کہاں ہے لاؤ ہم نے وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا کہ ایک مسلمان لڑکی سے شادی کے لئے وہ اسلام قبول کرنا چاہتا ہے، مولانا نے فرمایا: ارے اسلام لوگ یونہی لاتے ہیں، پھر اسلام ہی محبوب بن جاتا ہے، اسے بلاؤ!

ہمارے دوست نے فون سے فوری اس شخص سے رابطہ کرنا چاہا، لیکن کسی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا اور مولانا بڑی بے صبری سے وہیں صحن میں ادھر ادھر جواب کے انتظار میں ٹہلتے رہے، ہم نے عرض کیا کہ انشاء اللہ رابطہ کرکے کل ملاقات کرائیں گے، مولانا نے فرمایا: ہاں! دیکھو جانے نہ پائے اور دریافت پر "الرائد" کے دفتر میں اگلے دن صبح تقریبا دس بجے کا وقت متعین فرمایا: میں انتظار کروں گا اور واقعی اگلے روز آپ دفتر میں تنہا منتظر بیٹھے ملے، کیا لوگ تھے؟؟؟

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

استاد مرحوم بہتیری قومی و ملی سرگرمیوں میں مشغول تھے، پیام انسانیت فورم کے جنرل سکریٹری، سیکڑوں دینی وملی تنظیموں کے رکن و ذمہ دار اور کتنے ہی مدارس و مکاتب کے سرپرست تھے، انجمنوں کی جان، اداروں کی روح اور بزموں کے صدر نشین تھے، محفل کے لئے آپ کی حیثیت شمع تمثال تھی، آپ کے سانحۂ وفات کا نقصان ان سب کو محیط ہے۔

انسان کی زندگی عارضی ہے حقیقی زندگی تو موت کے بعد کی زندگی ہی ہے، موت ایک ایسی بے تردید حقیقت ہے جس سے ہر ایک کو سابقہ ہے، محبوب رب العالمین بھی اس سے مستثنی نہیں "قد خلت من قبله الرسل" یہ نیر تاباں بھی اپنی تمام ضیا پاشیوں کے بعد ایسے وقت میں جب اس کی ضرورت زیادہ اہم محسوس ہوتی تھی، ۳۰ جنوری ۲۰۱۳ء چہارشنبہ کی صبح ۳۰-۱۰ بجے روپوش ہوگیا اور اپنے پیچھے اداس اور سوگوار دنیا چھوڑ گیا، اس کے جانے سے اداروں کے کنول بجھ گئے، جلسے بے رونق اور محفلیں بے نور ہوگئیں۔

ویراں ہے میکدہ خم وساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

☆☆☆

فقہی مباحث

اسلام امن وسلامتی کا گہوارہ

محمد قمر الزماں ندوی

استاذ شعبہ عربی مدرسہ نور الاسلام کنڈہ پرتاپ گڈھ

اسلام ایک سراپا امن و سلامتی کا مذہب ہے ،اس کی تعلیمات ،اس کا فلسفہ زندگی اور اس کے اصول وضوابط سب کے سب ظلم و بربریت ،انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خلاف ہیں اسلامی تاریخ وتہذیب اور تعلیم کی روشنی میں اسلام ہی درحقیقت امن کا حامل ،علمبردار اور آئینہ دار ہے ،مذہب اسلام امن وسلامتی کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے بنیادی ضرورت قرار دیتا ہے ،اور اس کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے جان و مال پر حملہ کرے ،اسلام نے بے جا و بے قصور کسی انسانی جان کے ضیاع وقتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے ،جبکہ کسی جان کی تحفظ وحمایت اور زندگی کے بچاؤ کو پوری انسانیت کی حمایت اور بچاؤ قرار دیا ہے ،اسلام نے ظلم وستم قتل وغارت گری اور وحشت وحیوانیت پر نہ صرف نکیر کی بلکہ اسے قابل نفرت اور گردن زدنی جرم قرار دیا ہے۔

قرآن کریم جس عظیم ہستی پر نازل ہوا خود اس کا فرمان ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی یعنی غیر مسلم شہری کو دکھ پہنچائے تو خود میں (نبی ﷺ) قیامت کے دن اس مسلمان کے خلاف اس غیر مسلم کی طرف سے کھڑا ہوں گا ،کیا پیغمبر اسلام کے اس واضح فرمان کے بعد بھی اس پرو پیگنڈہ پر یقین کرنے کی گنجائش رہتی ہے کہ اسلام تشدد کا مذہب ہے ،اسلام اور تشدد دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں ،جہاں اسلام ہوگا تشدد وہاں کھڑا ہی نہیں ہوسکتا اسلام تشدد کے مقابلہ کے لئے سب سے طاقتور ہتھیار ہے ،حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز تہجد کے وقت بیدار ہوتے تو فرماتے ”اے اللہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام انسان آپس میں بھائی ہیں“ لہٰذا دنیا کے جس خطہ میں اور جہاں جہاں مسلم اور غیر مسلم ملی جلی آبادی میں رہتے ہیں وہ عملی اور سماجی زندگی میں اسی شہادت رسول کی روشنی میں ایک دوسرے کے ساتھی اور رفیق ہیں وہ شریعت اسلامیہ کی رو سے امن وسلامتی اور اعتماد وبھروسہ کے معاہدہ میں بندھے ہوئے ہیں ،دراصل اسلام بنیادی طور پر امن وسلامتی کی دعوت دیتا ہے ،جنگ پر صلح کو فوقیت دیتا ہے۔

دہشت گردی کی تعریف:۔

دہشت گردی کی کوئی مسلمہ اور متفقہ تعریف اب تک متعین نہیں کی جاسکی ہے ،اور نہ ہی اس کے حدود متعین کئے جا سکے ہیں ،چونکہ دہشت گردی اصطلاح کشادہ اور وسیع المفہوم ہے ،اس لئے اس کی بہت سی تاویلیں اور متعدد تعبیریں کی جا سکتی ہیں ،ثقافتوں اور نسلوں ،مصالح و اغراض ،قوموں اور مذاہب اور عقلوں اور فکروں کے اختلاف سے دہشت گردی کے بہت سے معنی ومفہوم متعین کئے جاسکتے ہیں ،تاہم عالمی سطح پر یہ اصطلاح استعمال کی جارہی ہے کہ حکومتیں اپنے سیاسی مخالفین کے تشدد اور غم وغصہ کے اظہار کو دہشت گردی

قرار دیتی ہیں، اور اس کے مخالفین حکومت کی سختی یا فوجی کارروائیوں کو سرکاری دہشت گردی کا نام دیتے ہیں، گویا حکمراں طبقہ عملی طور پر اس بات پر متفق ہے کہ منتخب یا مسلمہ حکومت کے خلاف کوئی بھی تشدد، احتجاج اور مظاہرہ دہشت گردی ہے۔

بہر صورت دہشت گردی کے معنی و مفہوم کی معقول اور سبھوں کے لئے قابل قبول تعیین اور حد بندی کے حوالہ سے خاصی پیچیدگی اور دشواری پائی جاتی ہے، تاہم مولانا عبدالحمید نعمانی دہشت گردی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''دہشت گردی صحیح معانی میں بے قصور اور معصوم افراد کو انسانی استحقاقی طور پر اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ایسی جارحانہ کارروائی اور ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کا نام ہے ہے جس سے وہ ہراساں و خوف زدہ ہو جائیں، ایسا فرد، قوم اور تنظیم کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور ادارہ اور ملک کی طرف سے بھی، یعنی کسی فرد، جماعت، قوم یا ملک اور ادارہ کا وہ عمل دہشت گردی ہے جس کا مقصد عام افراد کو عمومی طور پر اور اپنے مخالف قوت کو خصوصی طور پر دہشت میں ڈال کر اپنی غرض و مطلب کا حصول ہو۔'' (بحوالہ ماہنامہ دین مبین بھوپال)

حکومت کے ظالمانہ سلوک پر دہشت گردی کا اطلاق:۔

وہ حکومت جو اپنے ملک میں بسنے والے تمام طبقات کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک نہ کرے، بلکہ بعض طبقات کے ساتھ سیاسی و معاشی ناانصافی روا رکھے اور اس طبقہ کی جان و مال کے تحفظ میں دانستہ کوتاہی سے کام لے یا سرکاری طور پر ایسی تدبیریں اور کوششیں کی جائیں کہ وہ طبقہ جانی و مالی نقصان سے دوچار ہو تو ایسی حکومت اور ان کے اس غیر منصفانہ اور ظالمانہ رویہ پر بھی دہشت گردی کا اطلاق ہوگا۔ کیوں کہ بے قصور و معصوم افراد کو ستانا، ان کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک نہ کرنا، سیاسی و معاشی ناانصافی روا رکھنا اور دانستہ جان و مال کے تحفظ میں کوتاہی کسی فرد کی جانب سے ہو یا حکومت کی طرف سے، یہ سب دہشت گردی کے ہی زمرے میں آتے ہیں۔

حکومت کے غیر منصفانہ سلوک کے خلاف احتجاج:۔

اگر حکومت وقت کسی گروہ یا طبقہ کے ساتھ ناانصافی روا رکھتی ہے تو اس پر احتجاج اور ردعمل کا اظہار جائز ہی نہیں بلکہ جمہوری اور انسانی حدود میں رہ کر واجب ہے، دستور و قانون کے تحت تسلیم کئے گئے جائز حقوق کو حاصل کرنے کے لئے جد وجہد کرنا جائز ہے، جمہوری حکومت میں اپنے حقوق کے منوانے کے لئے جو طریقے مؤثر ہوتے ہیں ان سب کا استعمال کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ طریقے شرعی اعتبار سے دائرہ جواز میں آتے ہوں، اور جو طریقے سراسر غیر اسلامی ہوں ان کا اختیار کرنا جائز نہیں، یہ واضح رہے کہ مظلوم کا ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا دہشت گردی کے دائرہ میں نہیں آتا ہے۔

بے قصور افراد سے ظلم کا بدلہ لینا:۔

اگر کسی طبقہ کی طرف سے ظلم و زیادتی ہو جس میں اس طبقہ کے تمام افراد شریک نہ ہوں تو مظلوموں کو ظلم کرنے والے گروہ کے ان لوگوں سے بدلہ لینا جائز نہیں ہے، جو بے قصور ہوں اور جو خود اس ظلم میں شریک نہ ہوں، کیونکہ اسلامی شریعت میں چاہے افراد کا معاملہ ہو یا جماعت کا محض مذہبی اور مسلکی وابستگی کی بنیاد پر غیر متعلق افراد کو دوسرے عمل کے لئے ذمہ دار قرار دینا جائز نہیں، ایک کے عمل کے لئے دوسرے کو ذمہ دار قرار دینا قطعاً ناانصافی اور زیادتی ہے، البتہ ظلم و بربریت کے

خلاف اور مظلوموں کی حمایت کے لئے ممکنہ جائز طریقہ اپنایا جاسکتا ہے ،اس لئے اسلام نے جنگ کے دوران بھی بچوں ،عورتوں ،بوڑھوں ،عبادت میں مصروف اور جنگ کے لئے غیر اہل افراد سے تعرض کرنے سے سختی سے روکا ہے،قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس طرف توجہ دلائی ہے کہ جنگ سے غیر متعلق رہنے والے افراد کو دوران جنگ کسی قسم کا نقصان نہ پہونچایا جائے:"قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم" (بقرہ/۱۹۰) پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتہ غیر متعلق افراد کو قتل کرنے سے منع کیا:"لا تقتلوا شیخا فانیا وطفلا صغیرا و امرأۃ" (ابوداؤد کتاب الجہاد) (یعنی کمزور بوڑھے، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرو)۔

فقہائے اسلام تو کمزوروں ،عورتوں ،بچوں ،بوڑھوں کو جنگ کے دوران قتل کی نیت تک کو ناجائز کہتے ہیں ،عبادت گذار اور الگ تھلگ رہنے والے راہب وغیرہ کو بھی قتل کرنے سے منع کیا ہے،اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے امام محمدؒ نے ''السیر الکبیر'' میں نقل کی ہے ،ساتھ ہی اسلام نے عام تباہ کاری کی سخت مذمت کرتے ہوئے اس کی مخالفت کی ہے،آج کی مہذب دنیا میں بھی برسر جنگ دشمنوں کی ہر چیز اور غیر متعلق افراد کو بھی تباہ کاری کا نشانہ بنایا جاتا ہے لیکن اسلام اسے بدامنی اور فساد قرار دیتا ہے۔

اسلام تو اس حد تک امن پسند اور صلح پسند ہے کہ جنگ سے بھاگتے ہوئے لڑاکے کا تعاقب کرنے سے روکتا ہے ،فتح مکہ کے موقع پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خاص ھدایت فرمائی تھی ،تفصیلات کے لئے بدایۃ المجتھد ،نیل الاطار جلد ۸،زاد المعاد جلد۳، فتح القدیر فتح الباری جلد ۷ سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

دھشت گردی کے تدارک کے لئے اسلامی ھدایت :۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دہشت گردی کے کچھ نا کچھ بنیادی اسباب ومحرکات ہوتے ہیں ،جیسے کسی گروہ کے ساتھ معاشی یا سیاسی ناانصافی ،ان اسباب کے تدارک کے لئے اسلام کیا ہدایات دیتا ہے ہم اس کو نہایت اختصار سے پیش کرنے کی کوشش کررہے ہیں ،

۱۔اسلامی نظریہ کی رو سے ایک انسان بحیثیت انسان شرف وتکریم کے مقام پر کھڑا ہے،اس شرف وفضل مین مؤمن وکافر سب برابر ہیں ،اس لئے کسی انسان کو جواصلا معزز ہے ظلم وزیادتی کا نشانہ نہ بنایا جائے

۲۔کسی بھی طبقہ کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک اور اس کی تذلیل و تحقیر نہ کی جائے ،نیز کسی گروہ کے ساتھ معاشی اور سیاسی نا انصافی کو روا نہ رکھا جائے ،

۳۔مظلوم چاہے جس مذہب کا ہو اس کے ساتھ امتیازی سلوک برتنا تقاضائے انسانیت اور انصاف کے خلاف ہے ،لہذا فرد ہو یا حکومت ہر ایک کے لئے عدل وانصاف اور مساوات ضروری ہے ،

۴۔اسلامی حکومت کے زیر سایہ رہنے والے غیر مسلم باشندوں کی مذہبی ،معاشی ،تعلیمی آزادی کے ساتھ جان ومال کے تحفظ کی یقینی ضمانت اسلام فراہم کرتا ہے۔

۵۔مذہب اسلام نے انسانی زندگی کی حرمت کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے ،

۶۔اگر کسی مسلمان ملک میں غیر مسلم اقلیت آباد ہو تو اسلام میں اس کی جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کا پورا لحاظ کیا گیا ہے ،

۷۔اسی طرح نجی زندگی سے متعلق معاملات مین انھیں اپنے مذاہب پر چلنے کی مکمل آزادی فراہم کرتا ہے،

۸۔مذہب اسلام نہ صرف ظلم وتعدی سے روکتا ہے بلکہ ظلم کے جواب میں بھی دوسرے فریق کے بارے میں حد وانصاف سے متجاوز ہوجانے کو ناپسند کرتا ہے،

۹۔مذہب اسلام انتقام کے لئے بھی مہذب اور عادلانہ اصول وقواعد کو مقرر کرتا ہے جو افراط وتفریط سے پاک ہے،

۱۰۔مذہب اسلام غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی ہدایت دیتا ہے اور پوری انسانیت کو اللہ کا کنبہ قرار دیتا ہے۔

جان و مال ، عزت وآبرو کی حفاظت اور حدود:۔

اگر کسی گروہ یا فرد کی جان و مال اور عزت وآبرو پر حملہ حکومت وقت کی طرف سے ہو یا دہشت گرد اور فرقہ پرست تنظیموں اور تحریکوں کی طرف سے، اس کے دفاع اور سد باب کے لئے اٹھ کھڑا ہونا اور اس کے انسداد کے لئے حتی المقدور کوشش کرنا امت مسلمہ کے فرض منصبی میں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سب معاملات میں تحمل اور برداشت کی تعلیم دی ہے، مگر کسی ایسے حملہ کو برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دی جو دین اسلام کے مٹانے اور اسلام کے سوا دوسرا نظام کو مسلط کر نے کے لئے کیا جائے، اس نے سختی کے ساتھ حکم دیا کہ جو کوئی تمہارے انسانی حقوق چھیننے کی کوشش کرے، تم پر ظلم وستم ڈھائے، تمہاری جائز ملکیتوں سے تمہیں بے دخل کر دے تمہیں اپنے دین وایمان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روکے، تمہارے اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنا چاہے تو اس وقت اس کے مقابلہ میں اور ان کے سد باب میں ہرگز کمزوری نہ دکھاؤ، بلکہ اپنی پوری طاقت اس کے اس ظلم کو دفع کرنے میں صرف کردو" وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین" (بقرہ/۱۹۰) اور" اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ" (حج/۳۹-۴۰) مولانا سید ابوالاعلی مودودی ان دونوں آیات کی روشنی میں حسب ذیل احکام کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۱۔جب مسلمان سے جنگ کی جائے اور ان پر ظلم وستم کیا جائے تو ان کے لئے مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہے ۲۔جو لوگ مسلمانوں کے گھر بار چھینیں، انکے حقوق سلب کریں اور انھیں ان کی ملکیتوں سے بے دخل کریں ان کے ساتھ مسلمانوں کو جنگ کرنی چاہئے ۳۔جب مسلمانوں پر ان کے مذہبی عقائد کے باعث تشدد کیا جائے اور انھیں محض اس لئے ستایا جائے کہ وہ مسلمان ہیں تو ان کے لئے اپنی مذہبی آزادی کی خاطر جنگ کرنا چاہئے ۴۔دشمن غلبہ کرکے جس سرزمین سے مسلمانوں کو نکال دے، یا مسلمانوں کے اقتدار کو پامال کرے اور مٹادے اسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر نی چاہیے، اور جب کبھی طاقت ہو تو انہیں ان تمام مقامات سے دشمنوں کو نکال دینا چاہئے، جہاں سے انہوں نے مسلمانوں کو نکالا ہے، (الجہاد فی الاسلام/۶۳) البتہ غیر اسلامی ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ان کے پاس دفاع کی طاقت نہیں ہے، وہاں اس ظلم وزیادتی کے سد باب کے لئے حتی المقدور جمہوری طریقہ کو اپنایا جائے، جمہوری ممالک مین اپنے جائز حقوق کو منوانے کے لئے جو طریقے مؤثر ہو سکتے ہیں ان سب کا استعمال کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ طریقے شرعی اعتبار سے دائرہ جواز میں آتے ہوں۔

☆☆☆

زبان وادب

شبلی نعمانی اور ان کی اردو شاعری

حافظ ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی

اقوام کی زندگی میں جب انقلاب رونما ہوتا ہے تو تین قسم کے گروپ وجود میں آتے ہیں:

پہلے گروپ میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اپنی قدامت پرستی پر پورے طور سے قائم رہتے ہیں، اس میں کسی قسم کی تبدیلی قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

دوسرے گروپ میں ایسے افراد ہوتے ہیں جو اس انقلاب کی تاب نہ لاکر اپنے اصل راستے کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

تیسرے گروپ میں ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں جو اپنے اصل اصول پر قائم رہتے ہوئے اس میں جدت پیدا کرتی ہیں اور اپنے آپ کو حالات سے ہم آہنگی کرنیکی کوشش کرتی ہیں، اسی آخری مکتبۂ فکر میں علامہ شبلی نعمانی کا شمار ہوتا ہے۔

وہ ہمہ گیر اور جامع شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے اپنے قلم سے ادب، سیاست، تعلیم، مذہب اور فلسفہ کو متاثر کیا اور سب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے، آپ کا خاص میدان نثر نگاری تھا، ایک طرف سیرت پر ''سیرۃ النبی ﷺ'' جیسی منفرد کتاب لکھ کر اس فن کے معلم اول بن گئے تو دوسری طرف موازنہ انیس ودبیر جیسی گراں مایہ کتاب تصنیف کر کے فن تنقید کو بام عروج پر پہونچا دیا، آپ نے ان فنون کو اردو زبان میں منتقل کر کے اس کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا جس پر اردو زبان ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔

علامہ شبلی نے جہاں اپنی نثر نگاری سے اردو زبان کو مالا مال کیا وہیں انھوں نے اپنی اردو شاعری سے اسے جلا بخشی، اگرچہ ان کی اردو شاعری کا ذخیرہ بہت مختصر ہے، کیونکہ انھوں نے شاعری کی طرف بہت کم توجہ کی، اس کے بارے میں انھیں کی زبانی سنئے، وہ اپنے ایک دوست کو خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''ندوہ کے جھنجھٹ اور شاعری ساتھ ساتھ چلنے کی چیزیں نہیں، بہر حال چارہ بھی نہیں، ندوہ فرض مذہبی ہے اور شاعری فرض طبعی، کس کو چھوڑوں؟ پھر انھیں پر موقوف نہیں ایک دل ہزار سودا''۔

یہی وجہ ہے کہ شبلی نعمانی نے کبھی اپنے شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ اردو زبان کے مؤرخین نے اس کو حیثیت دی، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دوسرے کارنامے غیر معمولی اہمیت کے حامل تھے، ان سے ہٹ کر ان کی شاعری کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی۔

شبلی کی شاعری ان کی شگفتہ، لطیف اور رسا طبیعت کا کبھی کبھی کا ابال ہے جو شعریت کے ساتھ ساتھ اچھی اور صالح سماجی قدروں کی علمبرداری کرتی ہے، انھوں نے اپنی پرجوش و مزیدار سیاسی، اخلاقی اور تاریخی نظموں سے ایک خوشگوار اضافہ کیا، ان کے اسلوب میں شگفتگی و بانکپن اور چستی ملتی ہے، بقول عبداللطیف اعظمی کے، حالی نے اردو شاعری کو زندگی سے زیادہ قریب لانے کی کوشش کی لیکن یہ ابتدائی کوششیں تھیں شبلی نے اسے ترقی دے کر کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ اردو شاعری کو زندگی کے حقیقی مسائل سے قریب سے قریب تر لا کے ہندوستانی تہذیب کا آئینہ دار بنا دیا، جدید مسائل پر طبع آزمائی کی، اور ایک نئی شاعری کی داغ بیل ڈالی، شبلی کے یہاں غزل بہت کم ملتی ہے لیکن اس میں تغزل ہے۔ ان کا تغزل محض گل وبلبل کی حکایت اور جوانی کی داستان کیلئے نہیں ملک وقوم کے مسائل اور تاریخ کے اوراق کی تشریح کیلئے ہے۔ یہ زود ہضم بھی ہے اور صحت بخش بھی اسکا اندازہ ان کے کلام سے لگایا جاسکتا ہے، اسی کی مزید تشریح کیلئے غزل کے چند اشعار پیش کئے جارہے ہیں ؂

پوچھتے کیا ہو جو حال شب تنہائی تھا
رخصت صبر تھی یا ترک شکیبائی تھا
شب فرقت میں دل غمزدہ بھی پاس تھا
وہ بھی کیا رات تھی کیا عالم تنہائی تھا
اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل
غم سے مانا بھی کہ اس گھر میں خالی کرلوں
آپ جاتے تو ہیں اس بزم سے شبلی لیکن
حال دل کا کہیں اظہار نہ ہونے پائے

یہ شبلی ہی کی غزل گوئی تھی جو ان کے ابتدائی دور میں منظر عام پر آئی، ویسے وہ وقتاً فوقتاً سیاسی حالات پر نظمیں لکھتے رہے، سیاسی نظموں کے لکھنے کا رواج شبلی سے پہلے بہت کم تھا، اگر کسی نے اس پر طبع آزمائی بھی کی تو جرأت اور واضح طنز کا اظہار نہیں کر سکے، اسکے برعکس علامہ شبلی نعمانی نے جرأت اور ہمت کیساتھ شہنشاہیت کے خلاف نظمیں لکھیں، غیر ملکی اقتدار کی جڑوں پر ضربیں لگائیں، مسلم قوم کو آزادی کی راہ پر گامزن ہونیکی تلقین کی، علماء کو حجروں سے نکلنے کی دعوت دی، قوم پرست مسلمانوں کی رہنمائی اور قیادت کی، ایک نظم ''جنگ بلقان'' اور دوسری ''تقسیم بنگال'' کے حالات سے متأثر ہوکر لکھی جو اسوقت کے ناگفتہ بہ حالات کی عکاسی کرتی ہے، فرماتے ہیں ؂

عراق جاچکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے

جیتا ہے یہ ترکی کا مریض سخت جاں کب تک
حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
یہ ہیں وہ نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھائی ہے
یہ راگ ان کو سنا ئیگا یتیم ناتواں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو!
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

ایک دوسری جگہ قوم کوابھارنے اور غیرت دلانے کا کتنا مؤثر اوراچھوتا طریقہ اپنایا ہے،فرماتے ہیں ے

زوال دولت عثمان زوال شرع وملت ہے
عزیزو! فکرفر زندوعیال وخانماں کب تک
خدارا! تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں؟
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے تم یہ چیستاں کب تک

دوسری طرف ایک مسلمان کی حیثیت سے عالم اسلام کی خدمت کی، بقول علامہ سید سلیمان ندوی،علماء میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے وقت کی سیاسی باتوں میں دلچسپی لی ،کانگریس کی حمایت کی، ہندومسلم سیاسی مصلحت اور جنگ کے زوایہ نگاہ کو بدلنے کے لئے متعدد نظمیں لکھیں اور احرار کی بھی رہنمائی کی اور اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور نوا سنجیوں سے پر شور رکھا۔

طنز یہ شاعری قوم کو غیرت دلانے اور اصلاح کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے،اس میں غیر معمولی قدرت کی ضرورت ہے، علامہ شبلی نعمانی کو یہ قدرت بدرجہ اتم حاصل تھی،اسی لئے وہ ایک لفظ سے جو مفہوم ادا کرتے ہیں ،دوسرے پورے شعر میں بھی اتنا وسیع مفہوم نہیں ادا کر سکتے ،یونیورسٹی اور الحاق ،عرض ونیاز بجناب مالک الملک ،لیگ کی دائم المرضی کی علت اصل،بمبئی کی وفادار انجمن، یہ نظمیں اسکی بہترین آئینہ دار ہیں جسکی مثال اردو شاعری میں ملنی مشکل ہے،ان کی طنز یہ شاعری کے بارے میں رشید احمد صدیقی تحریر فرماتے ہیں:

’’لطیف طنز یہ لکھنے کا سہرا علامہ شبلی نعمانی کے سر ہے‘‘۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ہم اگر ان کی شاعری کے مختصر سے مجموعے پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ ایک بڑے اور سچے شاعر کے کلام میں جن خوبیوں کی ضرورت ہے وہ پوری طرح ان میں موجود ہیں، اسکی تصدیق ایڈیٹر’’الناظر‘‘ ظفر الملک کے قول سے ہوتی ہے، وہ دیباچہ مجموعہ کلام شبلی میں لکھتے ہیں کہ اگر شبلی نعمانی اپنی تمام قابلیتوں کے ساتھ اردو شاعری کیلئے وقف ہوجاتے تو حالی سے آگے نکل جاتے،ان میں ایک شاعر کی تمام قابلیتیں قدرت کی طرف سے ودیعت تھیں، اگر یہ دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے۔

☆☆☆

فکر وطن

2014ء کے عام انتخابات...... مسلم ایجنڈا کیا ہو؟

سید احمد ومیض ندوی

ملک کی آزادی میں مسلمانوں نے کس قدر قربانیاں پیش کیں اس سے ہر شخص واقف ہے۔ آزادی کی جنگ میں مسلمانوں کا جتنا لہو بہا ہے شاید دوسروں نے اتنا پسینہ بھی نہیں بہایا۔ ملتِ اسلامیہ کے ہر طبقہ نے ملک کو انگریزوں کے پنجہ استبداد سے آزاد کرنے کے لئے تن من، دھن کی بازی لگائی، ملک میں سب سے پہلے آزادی کا نعرہ لگانے والے ہمارے ہی اسلاف تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں علماء کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا، ہزاروں کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں، آزادی کی خاطر اتنی ساری قربانیاں دینے والی مسلم قوم آج ملک میں انتہائی کسمپرسی کی حالت سے دو چار ہے۔ مسلمان اس وقت گویا بے کسی و بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہیں، زندگی کے ہر شعبے میں زبوں حالی کا شکار ہیں، تعلیم ہو کہ معیشت، سیاست ہو کہ دفاع، دستوری حقوق کا معاملہ ہو کہ جان و مال اور عزت وآبرو کے تحفظ کا مسئلہ...... الغرض ہر میدان میں مسلمان خستہ حالی اور حرمان نصیبی کا سامنا کر رہے ہیں۔ ملک کو آزاد ہوئے چھ دہائیوں سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ اس طویل عرصہ میں مسلمانوں نے کھونے کے علاوہ کچھ نہ پایا، آزادی کے ساتھ فرقہ ورانہ فسادات کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہوا جو تا حال جاری ہے اور جس ہزاروں بے قصور مسلمان انتہائی بے دردی کے ساتھ شہید کر دئے گئے، کڑوروں کی املاک تباہ کی گئی، ان گنت مسلمان بے گھر کر دئے گئے، سیکڑوں کی تعداد میں مسلم خواتین بیوہ اور بچے یتیم کر دئے گئے، ہزاروں خاندان اجاڑ دئے گئے۔ آزادی کے بعد سے اب تک ۳۰ ہزار سے زائد چھوٹے بڑے فسادات ہو چکے ہیں۔ بعضے فسادات تو اتنے بھیانک تھے کہ انہیں فساد کے بجائے مسلمانوں کی منصوبہ بند نسل کشی کہنا چاہیے۔ ۲۰۰۲ء کے گجرات فسادات پر کیسی قیامت ٹوٹی اس کے تصور ہی سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مظفر نگر کے حالیہ فسادات میں بھی نہتے مسلمانوں کو چن چن کر نشانہ بنایا گیا۔ ملک کی کسی بھی ریاست کا کوئی بڑا شہر مسلم مخالف خونریز فسادات سے محفوظ نہیں۔ تواتر کے ساتھ ہونے والے ان فسادات نے مسلم اقلیت کو عدم تحفظ کے شدید احساس میں مبتلا کر دیا ہے۔ فسادات کے علاوہ فرقہ پرستوں کی جانب سے کی جانے والی دہشت گردانہ کاروائیوں کے دوران بے قصور مسلم نوجوانوں کو حراست

میں رکھ کر جو اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں اور بغیر کسی عدالتی کارروائی کے برسوں جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں وہ ایک ایسی المناک داستان ہے کہ اس پر خون کے آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے۔ پورے ملک میں جیلوں میں محروس نوجوانوں کی سب سے بڑی تعداد مسلم نوجوانوں کی ہے۔ پھر ایک بڑی تعداد ایسے مسلمانوں کی ہے جنہیں پولیس نے فرضی انکاؤنٹر مین ہلاک کر دیا۔ عشرت جہاں، سہراب الدین شیخ سے لے کر بٹلہ ہاوس انکاونٹر تک ایک طویل فہرست ہے جو پولیس کے ظالمانہ سیاہ کرتوتوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس سے ہٹ کر ملازمتوں کے معاملہ میں انہیں تعصب کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تعلیمی مواقع سے انہیں محروم رکھا جاتا ہے۔ پولیس محکمہ میں ان کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ بینکوں سے قرضوں کے حصول میں انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں سے مسلمانوں کو جان بوجھ کر دور رکھا جاتا ہے۔ الغرض زندگی کے ہر شعبہ میں انہیں پسماندگی کے گہرے دلدل میں دھکیل کر ان کی مجبوری و بے بسی کا تماشہ دیکھا جا رہا ہے۔ رہی ملک کی سیاسی پارٹیاں تو ان میں فرقہ پرست جماعتیں نفرت کی سیاست پر گامزن ہو کر اکثریتی ووٹ کو متحد رکھنے کے لئے ہر طرح کے نفرت انگیز حربے اپناتی رہتی ہیں۔ جہاں تک سیکولر پارٹیوں کا تعلق ہے تو وہ فرقہ پرستوں سے ڈر کر مسلم رائے دہندوں کا خوب استحصال کرتی ہیں۔ ۵۶ سالہ طویل عرصہ میں انتخابات میں مسلمانوں کا استحصال کر کے سیاسی پارٹیوں کے تو خوب وارے نیارے ہوئے لیکن مسلمانوں کے مسائل جوں کے توں برقرار رہے، انتخابات قریب آتے ہی ساری سیاسی پارٹیاں رائے دہندوں کو راغب کرنے کے لئے ہر ممکنہ حربہ استعمال کرتی ہیں۔ ملتِ اسلامیہ ہند کی یہ بد نصیبی رہی ہے کہ سیاسی پارٹیاں ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ کھلواڑ کرتی رہی ہیں۔ آزادی کے بعد سے مسلمان کانگریس کے سیکولرزم کے جھانسے مین پھنسے رہے، لیکن مسلمانوں کو فرقہ ورانہ فسادات اور تمام شعبوں میں پسماندگی کے سوا کچھ نہ ملا۔

کسی بھی جمہوری ملک میں سیاسی پارٹیوں سے اپنے جائز مطالبات منوانے کے لے انتخابات بہترین موقع ہوتے ہیں، اس وقت ملک میں پانچ ریاستوں کے اسمبلی انتخابات کے علاوہ ۲۰۱۴ء کے عام انتخابات کے لئے انتخابی مہم کا بگل بجایا جا چکا ہے، ملک بھر میں انتخابی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں، تمام سیاسی پارٹیاں عام انتخابات کو ذہن میں رکھتے ہوئے رائے دہندوں کو راغب کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔ مظفر نگر فسادات کے ذریعہ بی جے پی نے اپنی نفرت کی سیاست کا آغاز کر دیا ہے، آنے والے انتخابات پچھلے عام انتخابات سے اس معنی میں مختلف ہیں کہ ان انتخابات میں بی جے پی کی جانب سے ایک کٹر مسلم دشمن شخصیت کو وزارت عظمیٰ کے امیدوار کے طور پر میدان میں اتارا گیا ہے۔ اگر ایک طرف گجرات فسادات کے شعلوں کو ہوا دے کر مسلسل کامیابی حاصل کرنے والے مودی کے تعلق سے سنگھ پریوار غیر معمولی پر امید ہے تو دوسری جانب کانگریس گاندھی خاندان کے

سپوت راہل گاندھی کو وزارت عظمیٰ کے متوقع امیدوار کے طور پر نمایاں کر رہی ہے۔ سیاسی پارٹیاں چاہے سیکولر ہوں کہ فرقہ پرست ہر ایک کا ایک ہی ایجنڈا ہے اور وہ وعدوں کے سبز باغ دکھا کر عوام کو رجھانا، پھر ان کے ووٹوں کے سہارے اقتدار تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ ملک میں ہر قوم اور ہر جماعت کا ایجنڈا ہے، اگر کسی کا ایجنڈا نہیں ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ انتخابات قریب ہیں، لیکن اب تک مسلمانوں نے اپنا کوئی ایجنڈا مرتب نہیں کیا۔ جب بھی ملک میں انتخابات کا موسم آتا ہے، نام نہاد سیکولر پارٹیوں کو اچانک مسلمانوں سے ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے، پھر وہ مختلف وعدوں کے سبز باغ دکھا کر انہیں اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ اس وقت آنے والے عام انتخابات کا خوب چرچا ہے۔ ایسے میں مسلم قیادت کی ذمہ داری ہے کہ اول تو عام انتخابات کے تعلق سے شعور بیدار کرے، بہت سے مسلمان اپنے ووٹوں کی اہمیت سے ناواقف ہیں، چنانچہ ایک بڑی تعداد ووٹ کا استعمال سرے سے کرتی ہی نہیں۔ اس کے علاوہ فرقہ پرستوں کی سازش کے سبب بہت سے علاقوں میں ووٹر لسٹ سے مسلمانوں کے نام غائب ہیں۔ اس کا جائزہ لینا از حد ضروری ہے۔ اس سے ہٹ کر انتخابات کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بیشتر شہروں میں مسلمانوں کو فیصلہ کن موقف حاصل ہونے کے باوجود عدم اتحاد کے سبب ان کے ووٹ ضائع ہوجاتے ہیں۔ مسلم ووٹوں میں اتحاد پیدا کرنے اور ملک میں ملتِ اسلامیہ کو درپیش مسائل کے حل کے لئے ابھی سے مسلم ایجنڈا مرتب کرنا ضروری ہے، اس کے لئے سب سے پہلے پورے ملک کی ایک متحدہ مسلم قیادت تشکیل دی جائے جس میں تمام ریاستوں کی نمائندہ شخصیتوں اور جماعتوں کو نمائندگی دی جائے اور سب کے اتفاق سے مسلم ایجنڈا تیار کیا جائے اور پوری قوت کے ساتھ سیکولر پارٹیوں پر واضح کیا جائے کہ جب تک اس ایجنڈے پر عمل آوری کا قابل اطمینان تیقن نہیں دیا جاتا مسلمان ان کے حق میں اپنا ووٹ استعمال نہیں کریں گے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ ایجنڈا کن مطالبات پر مشتمل ہو تو اس کے چند نکات یہ ہوسکتے ہیں:

(۱) فرقہ وارانہ فسادات کا انسداد: یہ مسلم ایجنڈے کا سب سے بنیادی حصہ ہے۔ اس کے لئے ۲۰۱۱ء کے انسداد فرقہ ورانہ فساد بل کو فوری طور پر پارلیمنٹ میں پیش کر کے اسے منظور کرانے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔ کانگریس نے ۲۰۰۴ء میں اپنے انتخابی منشور میں اس کا وعدہ کیا تھا۔ ۲۰۰۵ء میں یہ بل پارلیمنٹ میں پیش بھی کیا گیا تھا، لیکن بعض تنظیموں کی شدید مخالفت کے بعد سے پاس نہ کیا جاسکا، اس کے بعد مختلف وفود نے اس میں بہت ساری ترامیم پیش کیں۔ پھر ٦ سال کے طویل عرصہ کے بعد یہ بل دوبارہ پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا، اس کے بعد سے یہ بل سرد خانے میں پڑا ہوا ہے۔ یہ بل اگر اس میں پائے جانے والے کچھ نقائص دور کئے جائیں تو مجموعی طور پر بہتر ہے اور اس کے ذریعہ فرقہ وارانہ فسادات پر بہت حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔

انسداد فرقہ ورانہ تشدد بل کیا ہے؟ اس بل کا پورا

نام Prevention of Communal and Targeted Violence (Access to Justice and Reparations) Act, 2011 ہے جوتقریبا ۵۵ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۱۱ باب اور ۱۳۵ سیکشن اور چار شیڈول ہیں۔ اس بل کی مختلف دفعات میں شفافیت اور ایمانداری کے ساتھ فسادات کی تفتیش کو یقینی بنانے کی بات کہی گئی ہے نیز مظلومین و متاثرین کی باز آبادکاری، مقتولین کے ورثاء کے لئے معقول معاوضہ اور نظم ونسق چلانے والے عہدیداروں کی گرفت وغیرہ سے متعلق مؤثر دفعات ہیں۔ سیکشن ۳ میں فرقہ ورانہ تشدد کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جس تشدد سے کسی فرد یا پورے گروپ کو نقصان پہنچتا ہو اور جس سے پورے ملک کا سیکولر نظام تباہ و برباد ہوتا ہو وہ فرقہ ورانہ تشدد ہے اور گروپ سے مراد مسلمان، سکھ، عیسائی اور دلت ہیں۔ اسی طرح سیکشن ۱۳ میں ایسے سرکاری ملازمین کے خلاف قانونی کاروائی کی بات کہی گئی ہے جو فسادات کے دوران اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ اگر اعلیٰ افسروں نے اپنے ماتحتوں کو تعصب پر مبنی احکامات دیئے اور ماتحتوں نے ان پر عمل کر دیا تو ان ماتحتوں کو بھی قصوروار ٹھہرایا جائے گا۔ اسی طرح سیکشن ۲۰ میں فسادات سے ملک کے امن میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو تو مرکزی حکومت کو مداخلت کا اختیار دیا گیا ہے اور سیکشن ۲۱ میں بتایا گیا ہے کہ مرکزی حکومت ایک سات رکنی نیشنل اتھاریٹی قائم کرے گی، جس کے تمام فیصلے معمولی اکثریت سے طے کئے جائیں گے، اس اتھارٹی کا مقصد فسادات کی روک تھام، ریلیف اور معاوضہ ہوگا۔ یہ اتھاریٹی حکومت کو فساد کے تعلق سے مشورے دے گی، اپیل سنے گی، رپورٹیں لے گی، مقدمات کی نگرانی کرے گی نیز سرکاری ملازمین کے رول پر نظر رکھے گی، اسی طرز پر ریاست میں ایک ریاستی اتھاریٹی ہوگی جو نیشنل اتھاریٹی کے تحت کام کرے گی۔

سیکشن ۱۱۰ مظلومین ومتاثرین کے معاوضہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے تحت حکومت متاثرین کو معاوضہ دے گی اور مجرم ثابت ہونے والوں کی جائیداد و ضبط کر کے معاوضہ وصول کرے گی۔ موت کی صورت میں کم از کم ۱۵ لاکھ معاوضہ، جسم کے عضو کے ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہوجانے کی صورت میں ۵ لاکھ۔ جزوی طور پر ناکارہ ہونے کی صورت میں ۳ لاکھ اور شدید زخمی ہونے کی صورت میں ۲ لاکھ معاوضہ ہوگا۔ اغوا میں ۲ لاکھ، زنا بالجبر کے لئے ۵ لاکھ ذہنی اذیت اور صدمے کیلئے کم از کم ۳ لاکھ معاوضہ دینا لازم قرار دیا گیا ہے۔ اگر مال یا جائیداد کا نقصان ہوجائے تو نقصان کی اصل قیمت اور اس میں افراطِ زر کو شامل کر کے معاوضہ دیا جائے گا۔ اس بل میں شامل دفعات کے تحت معاوضہ کی رقم حکومت کو ۳۰ دن کے اندر ہر حال میں ادا کر دینی ہوگی۔

جہاں تک خامیوں کا تعلق ہے تو اس بل کی ایک خامی یہ ہے کہ پولیس افسروں کو اس کے دائرہ میں نہیں لایا گیا جبکہ بیشتر فسادات میں پولیس کا رول انتہائی مشتبہ ہوتا

ہے۔ دوسری قابلِ اصلاح بات یہ کہ یہ بل پارلیمنٹ میں پاس ہونے کے ایک سال بعد قانونی شکل اختیار کرے گا۔ ظاہر ہے ایک سال کا عرصہ طویل ہے۔ ملک میں جس تیزی کے ساتھ فسادات ہو رہے ہیں، اس کے پیش نظر یہ مدت صرف دو تین ماہ کر دی جائے تو بہتر ہوگا۔ فرقہ پرست پارٹیوں کی جانب سے اس بل کی روزِ اول سے مخالفت کی جارہی ہے، محض اس وجہ سے کہ یہ بل قانونی شکل اختیار کر لے گا تو انہیں فرقہ پرستانہ ایجنڈا نافذ کرنے کا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ بل کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بتائی جارہی ہے کہ اس بل میں اکثریتی فرقے ہی کے خلاف کاروائی کا جواز رکھا گیا ہے جبکہ بل میں اقلیتی اور اکثریتی کی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ اسی طرح سرکاری ملازمین کو سزا دینے کی دفعات پر بھی انگشت نمائی کی جارہی ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ جب سرکاری عہدیدار تعصب اور فرقہ واریت میں ڈوب کر اپنے فرض منصبی سے پہلو تہی کریں گے تو ضرور ان کا مؤاخذہ ہونا چاہیے۔ فرقہ پرست طاقتیں اگر اس بل کی مخالفت کر کے اپنی اقلیت دشمنی کا ثبوت دیتی ہیں تو کوئی تعجب نہیں تعجب تو ان علاقائی پارٹیوں پر ہوتا ہے جو سیکولر ہونے کے باوجود اس بل کی مخالفت میں پیش پیش ہیں۔ بہر حال ۲۰۱۴ء کے عام انتخابات کے مسلم ایجنڈے میں فرقہ وارانہ تشدد انسداد بل کی فوری منظوری کو اولین ترجیح حاصل ہونی چاہیے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ یو پی اے اور اس کی ہمنوا سیکولر پارٹیوں پر یہ بات واضح کر دیں کہ مسلمان ۲۰۱۴ء کے عام انتخابات میں اسی وقت ان کی حمایت کریں گے جب وہ اس بل کو پاس کر دیں۔

(۲) مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے انتخابات میں ٹکٹ دئے جائیں۔ پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں مسلم نمائندگی دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کانگریس اور دیگر سیکولر پارٹیاں مسلم امیدواروں کو ٹکٹ نہیں دیتیں۔ پارلمانی انتخابات میں مسلم امیدواروں کو ۱۵ فیصد ٹکٹس دئے جائیں۔ راجیہ سبھا کے لئے ۱۵ فیصد نشستیں مسلم قائدین کے لئے رکھی جائیں۔ لوگ سبھا کے لئے ۱۵ فیصد امیدوار کامیاب نہ ہوں تو راجیہ سبھا کے لئے زیادہ تعداد مسلم امیدواروں کی نامزد کی جائے۔ اسی طرح اسمبلی انتخابات میں بھی مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے ٹکٹیں فراہم کی جائیں۔ منتخب نہ ہونے کی صورت میں قانون ساز کونسلوں کے لئے ان کی نامزدگی ہو۔

۳۔ پولیس اور فوج میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مسلم نوجوانوں کو بھرتی کر لیا جائے اس کے لئے قومی سطح پر مسلم تنظیموں کے توسط سے کوچنگ سنٹر قائم کئے جائیں۔

۴۔ اقلیتی کمیشن کو قانونی اختیارات تفویض کرتے ہوئے اس میں مسلمانوں کے لئے ایک خصوصی ونگ قائم کیا جائے۔

۵۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو تحفظات دئے جائیں، نیز غیر سرکاری تنظیموں کے لئے مختص فنڈس میں سے کم از کم ۲۰ فیصد فنڈس کی مسلم این جی او کے لئے

اجرائی عمل میں لائی جائے۔

۶۔مسلمانوں کے لئے کم از کم پانچ مرکزی یونیورسٹیوں کے قیام لئے عملی قدم اٹھایا جائے اور اقلیتی کالجوں میں اقلتیوں کے لئے کوٹہ بڑھا کر کم از کم ۷۰ فیصد کیا جائے۔اردو کو اس کا مستحقہ مقام دیتے ہوئے ملک کی ساری یونیورسٹیوں میں شعبہ اردو قائم کیا جائے اور عصری تعلیم گاہوں کی نصابی کتب سے قابل اعتراض مواد کو حذف کیا جائے۔تاریخ ہند اور مسلم حکمرانوں کے تعلق سے شامل کی گئی خلافِ حقیقت باتوں سے نصاب کو پاک کیا جائے۔

۷۔ملک کی کی ساری ریاستوں میں بے قصور مسلم نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد جیلوں میں ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہی ہے۔ان کی فوری رہائی کے لئے مؤثر اقدامات کئے جائیں۔

۸۔معاشی امور میں مسلمانوں کی بھر پور مدد کی جائے،سچر کمیٹی رپورٹ مسلمانوں کی معاشی و تعلیمی پسماندگی کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔اقلیتوں کی معاشی ترقی دراصل ملک کی مجموعی ترقی ہے۔مسلمانوں کی معاشی اصلاح کے لئے ممکنہ اقدامات کئے جائیں۔ اس کے لئے باقاعدہ نیشنل مسلم چیمبر آف کامرس کا قیام عمل لایا جائے۔اسی طرح نوجوانوں کا تجارت میں بھر پور تعاون کیا جائے کارپوریٹ سیکٹر میں ان کی نمائندگی بڑھائی جائے۔

۹۔ ملک میں موجود کروڑوں کی مسلم اوقافی جائیداد کا مسلمانوں کے لئے صحیح استعمال کو یقینی بنایا جائے۔مسلم اوقاف کا ایک بڑا حصہ ناجائز قابضوں کے زیر تصرف ہے،بہت سی اوقافی جائیدادوں پر خود حکومت قابض ہے۔اس سلسلہ میں قانونی چارہ جوئی کر کے مسلمانوں کی ہمہ جہت پسماندگی دور کرنے کے لئے اوقاف کا صحیح استعمال کیا جائے۔

یہ سرسری چند امور ہیں۔ملک کے قائدین اور دانشوران ملت اور مختلف ملی تنظیموں کے ذمہ داران سر جوڑ کر بیٹھیں تو اس قسم کی مزید باتیں مسلم ایجنڈے میں شامل کی جاسکتی ہیں۔مسلمانوں کا سب سے اہم مسئلہ انتخابی شعور کی بیداری کا ہے۔ملکی سطح کی مؤثر مسلم قیادت کے فقدان کے سبب اکثر مسلمان انتخابات کے موقع پر مفاد پرستوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔سیکولر کہلانے والی علاقائی پارٹیاں عین انتخابات سے قبل وعدوں کے سبز باغ دکھا کر مسلم ووٹ بٹورنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ملک میں ملتِ اسلامیہ کی مظلومی کی داستان انتہائی المناک ہے۔صرف مظلومی کا رونا مسائل سے نجات نہیں دلا سکتا۔ انتخابات کا موقع ہمارے لئے بہت بڑا ہتھیار ہے ہمیں اپنے ووٹوں میں اتحاد پیدا کرتے ہوئے جہاں فرقہ پرستوں کو شکست دینا ہے وہیں سیکولر پارٹیوں کو یہ پیغام دینا ہے کہ مسلمان محض ووٹ بینک نہیں ہیں۔

☆☆☆

تعاتف و تبصرہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نام کتاب: سب کے لئے
مؤلف: ابن غوری
صفحات: ۱۲۰
ناشر: ای، جی پبلشر، حیدرآباد
ملنے کے پتے: مکان مؤلف حیدرآباد، اور حیدر آباد کے مختلف کتب خانے۔
saibneghouri@gmail.com

پیش نظر کتاب ''سب کے لئے'' اپنے نام سے ہی اظہار کرتی ہے کہ وہ سب کے لئے ہے اور اسکو جس میدان اور جس ذوق کا بھی قاری ہاتھ میں لے گا، بغیر فائدہ اٹھائے نہ رہ سکے گا، درحقیقت یہ ابن غوری صاحب کے مطالعہ کا نچوڑ، ان کی تعمیری فکر کا نتیجہ اور مطالعہ کے دوران ہاتھ آئے مفید وبیش قیمت اور خوبصورت تراشوں کا حسین مجموعہ ہے،

اگر چہ یہ کوئی علمی شاہکار نہیں لیکن ایسی سنجیدہ تعمیری اور فکری کوشش ہے جس کی اس وقت ہمارے معاشرے کو سخت ضرورت ہے،

ابن غوری صاحب اپنے دینی جذبہ اور دینی خدمات کے ساتھ علمی حلقوں میں بھی اپنی عملی کاوشوں کے لئے معروف ومتعارف ہیں، اردو سے ان کی محبت اراسکو فروغ دینے کے لئے، اسٹیکر و پمفلٹ کی صورت میں ان کی بے لوث دعوت وکوشش قابل رشک ولائق تقلید ہے، اس سے قبل بھی ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور سب کی خصوصیت ملت اور نوجوانان ملت کو فائدہ پہنچانا ہے،

بقول پروفیسر محسن عثمانی ندوی ''ان کی تازہ تصنیف لطیف ہے'' اس میں انہوں نے علماء وصوفیاء حکام وقائدین اور مصلحین، ادیب، شاعر وصحافی اور فنکار نیز اطباء و سائنس دانوں تجار واصحاب ثروت اور اساتذہ وطلبہ کی دلچسپ ومفید باتیں، تعمیری واقعات اور ایسے جواہر پارے جمع کیے ہیں جن میں دروس وعبر اور حکمتوں کا خزانہ ہے،

کتاب کا ایک حصہ مشاہیر سے سوالات اور ان کے جوابات پر مشتمل ہے، جو انتہائی دلچسپ اور قابل مطالعہ اور معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کیلئے تشکیل شخصیت وکردار میں مفید ومعاون ہے، بقیہ تینوں ابواب شخصیات کا انوکھا تعارف، کتابوں کی دنیا اور نایاب اقوال بھی یقیناً فائدے سے خالی نہیں،

معنوی وظاہری ہر لحاظ سے کتاب دیدہ زیب ہے، اس کی رعنائی میں اس کے پیچھے کارفرما تعمیر کا جذبۂ صادق اضافہ کرتا ہے، قیمت بہت مناسب ہے، اس کا مطالعہ ہر پیر وجواں کے لئے مفید ہے،

☆☆☆